اسلام کی نشأۃِ ثانیہ

کرنے کا اصل کام

☼☼☼

از
اسرار احمد

مع تائید و توضیح بعنوان

فکرِ مغرب کی اساس

اور اس کا تاریخی پس منظر

از قلم
پروفیسر یوسف سلیم چشتی

شائع کردہ:
دار الاشاعت الاسلامیہ امرت روڈ۔ کرشن نگر۔ لاہور

مشمولات

ڈاکٹر اسرار احمد نے زیر اہتمام مصطفیٰ صادق وفاق پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ لاہور سے چھپوا کر دارالاشاعت الاسلامیہ ۔ امرت روڈ۔ کرشن نگر۔ لاہور ۱۲ سے شائع کیا

بار اوّل : ــــ مئی ۱۹۶۸ء ــــ تعداد ۱۱۰۰

قیمت : ــــ ایک روپیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

پیش نظر کتابچہ دو مضامین پر مشتمل ہے :-

ایک راقم الحروف کا تحریر کردہ مضمون جو ماہنامہ 'میثاق' لاہور کے جون ۱۹۶۵ء کے شمارے میں 'تذکرہ و تبصرہ' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اور

دوسرا مخدومی پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا مضمون جو دراصل ایک خط ہے جو موصوف نے متذکرہ بالا مضمون کی تائید و توثیق اور توضیح مزید کے لیے تحریر فرمایا اور 'میثاق' کی نومبر دسمبر ۱۹۶۵ء کی مشترک اور جنوری ۱۹۶۶ء کی اشاعتوں میں بالاقساط شائع ہوا۔

اصل مضمون کے آخر میں "عملی اقدامات" کے ذیل میں جو دو تجاویز پیش کی گئی تھیں ان کے ضمن میں گذشتہ دس ماہ کے عرصے میں اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے جن کاموں کی ابتدا ہو گئی ہے ، سطور ذیل میں ان کا مختصر تذکرہ پیش کیا جا رہا ہے۔

ان میں سے پہلی تجویز یہ تھی :

"کہ عمومی دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا ادارہ قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدید ایمان اور اصلاح اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجہ ہوں ان کی ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کرے اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیت ان لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے آرزومند ہیں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوانوں کو تلاش کرے جو پیش نظر علمی کام کے لیے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں"

خدا کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ مولانا عبدالغفار حسن اور شیخ سلطان احمد صاحب کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں "عمومی دعوت و تبلیغ" کا وہ "ادارہ" جس کا تذکرہ سطور بالا میں کیا گیا تھا "تنظیم اسلامی" کے نام سے قائم ہو گیا ہے اور اس کی تاسیسی قرار داد میں بھی یہ الفاظ موجود ہیں کہ :

"عامۃ الناس کو دین کی دعوت و تبلیغ کی جو ذمہ داری امتِ مسلمہ پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتی ہے ، اس کے ضمن میں ہمارے نزدیک اہم ترین کام یہ ہے کہ جاہلیتِ قدیمہ کے باطل عقائد و رسوم اور دورِ جدید کے گمراہ کن افکار و نظریات کا مدلّل ابطال کیا جائے اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کے لیے کتاب و سنت کی ہدایت و رہنمائی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ ان کی اصلی حکمت اور عقلی قدر و قیمت واضح ہو اور وہ شبہات و شکوک رفع ہوں جو اس دور کے لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں ۔"

اور اس کی "توضیح" میں مزید وضاحت کر دی گئی ہے کہ :

" اس ضمن میں ہمارے نزدیک اس وقت کرنے کا اہم ترین کام یہ ہے کہ ایک طرف ادیانِ باطلہ کے مزعومہ عقائد کا مؤثر و مدلّل ابطال کیا جائے اور دوسری طرف مغربی فلسفہ و فکر اور اس کے لائے ہوئے زندقہ و الحاد اور مادّہ پرستی کے سیلاب کا رُخ موڑنے کی کوشش کی جائے ، اور حکمتِ قرآنی کی روشنی میں ایک ایسی زبردست جوابی علمی تحریک برپا کی جائے جو توحید ، معاد اور رسالت کے بنیادی حقائق کی حقانیت کو بھی مبرہن کر دے اور انسانی زندگی کے لیے دین کی رہنمائی و ہدایت کو بھی مدلّل و مفصّل واضح کر دے ۔ ہمارے نزدیک اسلام کے حلقے میں نئی اقوام کا داخلہ اور جسدِ دین میں نئے خون کی پیدائش ہی نہیں خود اسلام کے موجود الوقت حلقہ بگوشوں میں حرارتِ ایمانی کی تازگی اور دین و شریعت کی عملی پابندی اسی کام کے ایک مؤثر حد تک تکمیل پذیر ہونے پر موقوف ہے ! اس لیے کہ دورِ جدید کے گمراہ کن افکار و نظریات کے سیلاب میں خود مسلمانوں کے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بڑی تعداد اس

طرح بہہ نکلی ہے کہ ان کا ایمان بالکل بے جان اور دین سے ان کا تعلق محض برائے نام رہ گیا ہے اور اسی بنا پر دین میں نت نئے فتنے اٹھ رہے ہیں اور ضلالت و گمراہی نت نئی صورتوں میں ظہور پذیر ہو رہی ہے۔

اس سلسلے میں انفرادی کوششیں تو اب بھی جیسی کچھ بھی عملاً ممکن ہیں جاری ہیں اور آئندہ بھی جاری رہیں گی ضرورت اس کی داعی ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو وسائل فراہم کئے جائیں اور ایک ایسے باقاعدہ ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جو حکمتِ قرآنی اور علمِ دینی کی نشر و اشاعت کا کام بھی کرے اور ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا بھی مناسب اور موثر بندوبست کرے جو عربی زبان، قرآن حکیم اور شریعتِ اسلامی کا گہرا علم حاصل کر کے اسلامی اعتقادات کی حقانیت کو بھی ثابت کریں اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے جو ہدایات اسلام نے دی ہیں انہیں بھی ایسے انداز میں پیش کریں جو موجودہ اذہان کو اپیل کر سکے۔"

"تنظیم اسلامی" جس کے قیام کا فیصلہ اللہ کا نام لے کر کیا جا چکا ہے بہرحال ابھی بالکل ابتدائی دور میں ہے اور ابھی اسے بہت سی ابتدائی منازل طے کرنی ہیں جن کے لیے لامحالہ کچھ وقت درکار ہے۔ بہرحال ہمیں اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے پوری امید ہے کہ اللہ کے جن چند بندوں نے محض اس کی تائید و نصرت کی امید پر ایک عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ ابتدائی مشکلات و موانع کا سامنا ہمت اور عزیمت کے ساتھ کر کے جلد ہی اسے بقول مولانا امین احسن اصلاحی "ایک چلتا ہوا قافلہ" بنا دیں گے۔ اور اس کے ضمن میں جہاں افراد کی "دینی و اخلاقی تربیت" اور ان میں "دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت" کے جذبے کے نشو و نما کا اہتمام کیا جائے گا وہاں اس "جوابی علمی تحریک" کے برپا کرنے کی سعی و جدوجہد بھی کی جائے گی جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے ؛

دوسری تجویز یہ تھی کہ :

"ایک قرآنی اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جو ایک طرف علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت

کا بندوبست کرے تاکہ قرآن کا نور عام ہو اور اس کی عظمت لوگوں پر آشکارا ہو اور
دوسری طرف ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے جو بیک وقت علوم
جدیدہ سے بھی بہرہ ور ہوں اور قرآن کے علم و حکمت سے بھی براہ راست آگاہ
ہوں تاکہ متذکرہ بالا علمی کاموں کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔"

ظاہر ہے کہ "قرآنی اکیڈمی" کے مندرجہ بالا منصوبے اور اس مجوزہ ادارے کے مابین کوئی فرق نہیں ہے جس کا تذکرہ "تنظیم اسلامی" کی اساسی قرارداد اور اس کی توضیحات میں کیا گیا ہے اور جس کا قیام "تنظیم اسلامی" کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ لیکن چونکہ یہ ادارہ بہرحال کسی ایک مقام ہی پر قائم ہو گا اور ایسا مقام سوائے لاہور کے اور کونسا ہو سکتا ہے اس لیے کہ ایک تو ویسے بھی اسے پاکستان کے علمی و ثقافتی مرکز ہونے کا مقام از خود حاصل ہے اور دوسرے خدا کے فضل و کرم سے یہاں بعض ایسے کاموں کی ابتداء ہو بھی چکی ہے جو کسی آئندہ مرحلے پر باہمی ادغام سے "قرآنی اکیڈمی" کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ لہٰذا "تنظیم اسلامی" کے رفقائے لاہور کو ابتداء ہی سے اپنی سرگرمیوں میں اس کے قیام کو مرکزی اہمیت دینی چاہیے۔ ذاتی طور پر راقم سطور بلا ادنیٰ شائبہ تعلّی یہ عرض کرتا ہے کہ "قرآن اکیڈمی" کا قیام اس کی زندگی کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے اور اس کی بیشتر مساعی اور بہترین صلاحیتیں انشاء اللہ اسی مقصد کے لیے وقف رہیں گی۔

"قرآنی اکیڈمی" کا یہ منصوبہ دو بڑے بڑے اجزاء پر مشتمل ہے یعنی ایک "علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت" اور دوسرے "مقاصد متذکرہ بالا کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کرنے والے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت"۔

'دار الاشاعت الاسلامیہ' کا قیام ان میں سے پہلے مقصد کے لیے ہی عمل میں لایا گیا ہے اس کے تحت 'میثاق' کے دوبارہ اجراء میں یہ مقاصد بھی پیش نظر تھے کہ ایک طرف مولانا اصلاحی کے لیے تفسیر 'تدبر قرآن' کی تحریر کے لیے مسلسل تحریک موجود رہے اور جتنی کچھ تفسیر وہ لکھتے جائیں وہ لوگوں کے سامنے آتی چلی جائے۔ دوسری طرف مولانا فراہیؒ کے مسودات کے تراجم کی اشاعت تسلسل کے ساتھ ہوتی رہے۔ تیسرے حلقۂ تدبر قرآن سے منسلک نوجوانوں کے لیے تحریر

کی مشق اور تصنیف و تالیف کی تربیت کا سامان ہوتا رہے، بحمد اللہ 'میثاق' ان سارے ہی مقاصد کو باحسن وجوہ پورا کر رہا ہے۔

'تدبر قرآن' کی جلد اوّل کی طباعت 'دارالاشاعت الاسلامیہ' کا وہ کارنامہ ہے جس کے لیے وہ جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ خصوصاً جبکہ اس کی طباعت ہر اعتبار سے معیاری ہوئی۔ راقم الحروف کی ذاتی خواہش تو یہ ہے کہ جیسے ہی سورۂ مائدہ 'میثاق' میں چھپ کر مکمل ہو 'تدبر قرآن' کی جلد دوم بھی جو سورۂ نساء اور سورۂ مائدہ کی تفاسیر پر مشتمل ہوگی مارکیٹ میں آجائے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا انحصار اس پر ہے کہ جلد اوّل جلد از جلد اپنے قدر دانوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکے اور اس پر جو لاگت آئی ہے اس کا معتدبہ حصّہ واپس آجائے اور یہ معاملہ بہرحال راقم الحروف کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ اس کی تمام تر ذمّہ داری 'تدبر قرآن' کے قدردانوں پر ہے جس کی فکر انہیں کرنی چاہیئے۔

مولانا اصلاحی کی دوسری تصانیف 'حقیقتِ شرک، حقیقتِ توحید، حقیقتِ تقویٰ' 'تدبر قرآن'، دعوتِ دین اور اس کا طریق کار، اور سلسلۂ اسلامی ریاست کی اشاعت بھی "علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت" کے ضمن میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ خدا کرے کہ اس کی بھی کوئی صورت جلد پیدا ہو جائے۔

پیشِ نظر کتابچے کی اشاعت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ 'قرآن اکیڈمی' کے قیام کی تجویز اپنے استدلالی پس منظر کے ساتھ زیادہ وسیع حلقے میں پھیل بھی سکے اور مسلسل پیش نظر بھی رہ سکے۔ اس سلسلۂ اشاعت کی دوسری کڑی انشاء اللہ وہ تقریر ہوگی جو راقم نے حال ہی میں "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کے عنوان سے متعدد مقامات پر کی ہے۔

اس پورے سلسلۂ اشاعت سے مقصود بہرحال یہی ہے کہ "عام لوگوں کی توجہات قرآن حکیم کی جانب منعطف ہوں ذہنوں پر اس کی عظمت کا نقش قائم ہو، دلوں میں اس کی محبت جاگزیں ہو اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہو جائے"!

اسی مقصد کے حصول کا ایک اہم اور موثر ذریعہ 'حلقہ ہائے مطالعہ قرآن' کا قیام ہے۔

جس کی ابتداء بھی بفضلہ تعالےٰ متعدّد مقامات پر ہو چکی ہے۔ خیال یہ ہے کہ حلقہ ہائے مطالعہ قرآن کا ایک جال نہ صرف لاہور بلکہ پورے پاکستان میں بچھا دیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے براہِ راست رابطہ قائم ہو جائے اور قرآن حکیم کی جانب توجہ و التفات کی ایک عام رَو چل نکلے۔ یہ حلقے انشاء اللہ ایسے نوجوانوں کی تلاش کے ضمن میں انتہائی اہم ثابت ہوں گے جو اپنی زندگیوں کو قرآن کے علم و حکمت کی تحصیل اور اس کی نشر و اشاعت کیلئے وقف کرنے کو تیار ہو جائیں۔ اور عجب نہیں کہ یہی حلقے مستقبل کی قرآن اکیڈمی کے 'بھرتی کے مرکز' (RECRUITMENT - CENTRES) ثابت ہوں!

جن نوجوانوں کو قرآن مجید سے ذہنی مناسبت اور قلبی انس پیدا ہو جائے ان کے لیے فوری طور پر کم از کم ابتدائی عربی کی تعلیم کا اہتمام ناگزیر ہے۔ اس کام کی بھی چند مقامات پر تو ابتداء ہو چکی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ نہ صرف یہ کہ اپنے اہتمام میں اس کام کو وسیع پیمانے پر کیا جائے بلکہ دوسرے اداروں سے بھی اس ضمن میں مدد لی جائے!

متذکرہ بالا تمام کام 'قرآن اکیڈمی' کے مبادی میں سے ہیں۔ اس کا اصل کام ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم و تربیت کا باقاعدہ اہتمام ہے جو اپنی زندگیوں کو قرآن مجید کے علم و حکمت کی تحصیل اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے 'وقف' کرنے کو تیار ہو جائیں۔

مولانا اصلاحی نے حلقہ تدبر قرآن کی بنیاد اسی مقصد کے لیے رکھی تھی اور ابتداءً اس کا کام پورے جوش و خروش کے ساتھ جاری بھی ہو گیا تھا لیکن باقاعدگی اور پوری دلچسپی و دلجمعی کے ساتھ یہ حلقہ غالباً صرف تین سال کام کر سکا۔ اور اگرچہ کچھ نہ کچھ کام تو اس حلقے کے تحت اب بھی جاری ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسے از سرِ نو منظم کرنے کی شدید ضرورت ہے تاکہ یہ دوبارہ ایک فعّال اور جاندار حلقہ بن جائے اور مولانا کا جو وقت اس پر صرف ہوتا ہے اس سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔

اس حلقے کے تجربے سے دو باتیں واضح ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ عربی زبان کی تعلیم و تدریس کا جو اسلوب مولانا نے اختیار فرمایا اور قرآن، حدیث اور فقہ کے درس کے لیے جو نصاب تجویز کیا وہ نہایت مفید ہے، اور سنجیدہ، فہیم اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دین کی تعلیم کا یہ طریقہ انتہائی

کامیاب ہوسکتا ہے۔ اور دوسرے ــــــ یہ کہ جو مقصد پیش نظر ہے اس کے لیے جزوقتی کام سوائے استثنائی صورتوں کے مفید نہیں ہے بلکہ یہ محنت صرف ان نوجوانوں پر صرف کی جانی چاہیئے جو "تعلّم و تعلیم قرآن" کو اپنی زندگی کا اصل مقصد بنالیں اور اس کے لیے اپنے آپ کو 'وقف' کرنے کو تیار ہوں۔ گویا کہ یہی ان کا اصل CAREER بن جائے اور اس کے لیے وہ 'قوتِ لایموت' پر گزران اور ہر قربانی و ایثار پر آمادہ ہوں۔

ایسے نوجوانوں کی تلاش اور ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہی کا ایک تجربہ چند سال قبل منٹگمری میں ایک ایسے ہاسٹل کے قیام کی صورت میں کیا گیا تھا جس میں کالجوں کے زیر تعلیم طلباء میں سے دینی مزاج رکھنے والے طلبہ کو اس غرض سے رکھا گیا تھا کہ ایک طرف کالجوں میں وہ فکرِ جدید سے شناسا ہوں اور دوسری طرف ہاسٹل میں انہیں عربی، قرآن اور حدیث کی تعلیم دی جائے اور ان کی اخلاقی تربیت بھی کی جائے اور ان میں "اسلام کی نشأۃ ثانیہ" کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے کا جذبہ بھی پیدا کیا جائے ــــــ یہ ہاسٹل بھی اگرچہ تین سال ہی قائم رہ سکا تھا لیکن اس تجربے سے بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی تھی کہ عملی اعتبار سے یہ طریقہ بہت کامیاب ہے۔ اب خیال یہ ہے کہ یہی کام لاہور میں شروع کیا جائے اور ایک "دار المقامہ"[1] ارضِ لاہور پر ایسا قائم کیا جائے جو انسانوں کے لیے واقعۃً جنتِ فکر و نظر اور فردوسِ قلب و روح بن جائے ــــــ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑا کام اور ایک ایسی عظیم الشان مہم ہے جس کا سر کرنا آسان نہیں الّا ان یشاء اللّٰہ ــــــ ہمیں یقین ہے کہ جس ہستیٔ تبارک و تعالیٰ نے ہمارے دل میں اس نیک ارادے کو پیدا فرمایا ہے وہی اس کی تکمیل کی راہیں بھی کھولے گا۔ السّعی منّا والاتمام من اللّٰہ۔!!

بہر حال 'حلقۂ تدبرِ قرآن' اگر وہ دوبارہ منظم و متحرک کیا جا سکا۔ اور مجوزہ 'دار المقامہ' اگر وہ قائم ہو سکا، ان دونوں میں سے کوئی ایک ترقی پا کر ــــــ یا دونوں باہم مدغم ہو کر 'قرآن اکیڈمی' کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ وما ذالک علی اللّٰہ بعزیز ۵

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

---

[1] "دار المقامہ" آباد رہنے کی جگہ؛ سورۂ فاطر میں اہل جنت کے ایک قول میں جنت کو اس نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

اسلام کی نشاۃ ثانیہ کرنے کا اصل کام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء

موجودہ دور بجا طور پر مغربی فلسفہ و فکر اور علوم و فنون کی بالادستی کا دور ہے اور آج پورے کرۂ ارضی پر مغربی افکار و نظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصوّرات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتداء آج سے تقریباً دو سو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی اور جو اس کے بعد مسلسل مستحکم ہوتے اور پروان چڑھتے چلے گئے۔ آج کی دُنیا سیاسی اعتبار سے خواہ کتنے ہی حصّوں میں منقسم ہو تقریباً ایک ہی طرزِ فکر اور نقطۂ نظر پوری دنیا پر حکمران ہے اور بعض سطحی اور غیر اہم اختلافات سے قطع نظر ایک ہی تہذیب اور ایک ہی تمدّن کا سکّہ پوری دنیا میں رواں ہے۔ کہیں کہیں منتشر طور پر کوئی دوسرا نقطۂ نظر اور طرزِ فکر اگر پایا بھی جاتا ہے تو اس کی حیثیت زندگی کی اصل شاہراہ سے ہٹی ہوئی پگڈنڈی سے زیادہ نہیں ہے۔ ورنہ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ جو طبقے قیادت و سیادت کے مالک ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اجتماعی زندگی اور اس کے جملہ متضمّنات کی اصل زمام کار ہے وہ سب کے سب بلا استثناء ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلّط اس قدر شدید اور ہمہ گیر ہے کہ بعض ان قوّتوں کے نقطۂ نظر کا جائزہ بھی اگر دقّتِ نظر سے لیا جائے جو مختلف ممالک میں مغربی تہذیب و تمدّن کے خلاف صف آرا ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مغرب کے اثرات سے بالکلیہ محفوظ نہیں ہیں اور خود ان کا طرزِ فکر بہت حد تک مغربی ہے۔

بُنیادی نقطۂ نظر

تہذیبِ جدید کی بنیادوں میں جو فکر کام کر رہا ہے وہ نہ تو کوئی ایک دن میں پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی کوئی سادہ اور بسیط شئے ہے بلکہ ان ڈیڑھ دو سو سالوں کے دوران فلسفے کے

کتنے ہی مکاتبِ فکر یورپ میں پیدا ہوئے اور کتنے ہی زاویہ ہائے نگاہ سے انسانوں نے انسان اور انسانی زندگی پر غور و فکر کیا ——— لیکن اس پورے ذہنی و فکری سفر کے دوران ایک نقطۂ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پورے فکر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں 'خیالی' اور 'ماورائی' تصوّرات کے بجائے ٹھوس حقائق و واقعات کو غور و فکر اور سوچ بچار کا اصل مرکز و محور ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور خدا کے بجائے 'کائنات'، روح کے بجائے مادّہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصوّر کے بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوعِ بحث قرار دیا گیا ہے۔ خالص علمی سطح پر تو اگرچہ یہ کہا گیا کہ ہم خدا، روح اور حیات بعد الممات کا نہ اقرار کرتے ہیں نہ انکار لیکن اس عدمِ اقرار و انکار کا نتیجہ بہرحال یہ نکلا کہ یہ 'تصوّرات' رفتہ رفتہ بالکل خارج از بحث ہوتے چلے گئے اور انسان کے سارے غور و فکر اور تحقیق و تجسّس کا مرکز و محور کائنات، مادّہ اور حیاتِ دنیوی ہی بن کر رہ گئے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جن بے پناہ قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ انہیں جس میدان میں بھی استعمال کرے نتائج بہرحال رونما ہوتے ہیں اور ہر ڈھونڈنے والا اپنے اپنے دائرۂ تحقیق و جستجو میں نئی دنیائیں تلاش کر سکتا ہے ——— پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جس طرح کائنات کی عظمت و وسعت کے اعتبار سے مہرِ درخشاں کی حیثیت و وقعت ایک "ذرّہ فانی" سے زیادہ نظر نہیں آتی لیکن اگر ایک "ذرّہ فانی" کی حقیقت و ماہیت پر غور کیا جائے تو وہ بجائے خود "مہرِ درخشاں" کی عظمت و سطوت کا حامل نظر آتا ہے[1] اسی طرح حقیقتِ نفس الامری کے اعتبار سے چاہے خدا کے مقابلے میں کائنات، روح کے مقابلے میں مادّہ اور حیاتِ اخروی کے مقابلے میں حیاتِ دنیوی کیسے ہی حقیر اور کتنے ہی بے وقعت ہوں اگر نگاہوں کو انہی پر مرکوز کر دیا جائے تو خود ان کی وسعتیں بے کراں اور گہرائیاں

---

[1] مہرِ درخشاں ذرّہ فانی ——— ذرّہ فانی مہرِ درخشاں (ڈاکٹر نیازی)

انتہاء نظر آنے لگتی ہیں۔

چنانچہ یورپ میں جب 'کائنات' اور 'مادّہ' تحقیق و جستجو کا موضوع بنے تو یکے بعد دیگرے ایسے ایسے عظیم انکشافات ہوئے اور بظاہر خفتہ و خوابیدہ مظاہرِ قدرت کے پردوں میں ایسی ایسی عظیم قوتوں اور توانائیوں کا سراغ ملا کہ عقلیں دنگ اور نگاہیں چکاچوند ہو کر رہ گئیں اور علم و فن کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا ——— قدرت کے قوانین کی مسلسل دریافت، فطرت کی قوّتوں کی پیہم تسخیر اور نت نئی ایجادات و اختراعات نے ایک طرف تو یورپ کو ایک ناقابلِ شکست قوت بنا دیا اور دوسری طرف مادّے کی یہ عظمت اور اس کی قوتوں کی یہ سطوت بجائے خود اس امر کی دلیل بنتی چلی گئیں کہ اصل قابلِ التفات شَے مادّہ ہے نہ کہ روح، اور کائنات اور اس کے قواعد و قوانین ہیں نہ کہ خدا اور اس کی ذات و صفات! ——— !!

عالمِ اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش

فطرت کی ان نو تسخیر شدہ قوّتوں سے مسلّح ہو کر مغرب جب مشرق پر حملہ آور ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیلاب کے مانند پورے کرۂ ارضی پر چھا گیا اور مشرقی اقوام اور ان کی عظیم حکومتیں اور سلطنتیں اس سیلاب میں ریت کے کچّے گھروندوں کی طرح بہتی چلی گئیں۔ اس سیلاب کا اوّلین شکار چونکہ مشرقِ قریب اور مشرقِ وسطیٰ تھے جہاں مسلمان آباد تھے۔ لہٰذا اس کی سخت ترین یورش اسلام اور اہلِ اسلام پر ہوئی اور چند ہی سالوں کے اندر اندر پورا عالمِ اسلام یورپ کے زیرِ نگیں ہو گیا۔

عالمِ اسلام پر مغرب کا یہ استیلا دوگونہ تھا۔ یعنی عسکری و سیاسی بھی اور ذہنی و فکری بھی۔ لیکن یورپ کی اوّلین اور نمایاں ترین یورش چونکہ سیاسی تھی لہٰذا عالمِ اسلام میں جو ردِّ عمل اس کے خلاف پیدا ہوا اس میں بھی اوّلاً اسی کا احساس غالب نظر آتا ہے۔ ملّتِ اسلامی کے

اس تلخ احساس نے کہ یورپ نے کہیں براہ راست تسلط اور قبضے۔ اور کہیں انتداب و تحفظ و حمایت کے پردے میں اسے اپنا محکوم بنا لیا ہے اور اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اس کی وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ بار ہا دردانگیز نالوں کی صورت اختیار کی اور اپنے شاندار ماضی کی حسرت بھری یاد، اپنی "عمرِ رفتہ" اور عظمت و سطوتِ گزشتہ کے بازیافت کی شدید تمنّا اور "گردشِ ایام" کو پیچھے کی طرف لوٹانے کی بے پناہ خواہش نے کبھی سیّد جمال الدین افغانی کی سیماب وش شخصیّت کا رُوپ دھارا اور کبھی تحریکِ خلافت کی صورت اختیار کی لیکن حقائق نے ہر بار جذبات و خواہشات کا منہ چڑایا۔ اور مغرب کی سیاسی بالادستی رفتہ رفتہ ایک تسلیم شدہ واقعہ کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔

اپنے سیاسی تسلّط کو مستحکم کرتے ہی یورپ نے دنیائے اسلام میں اپنے افکار و نظریات کا پرچار اور اپنے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبلیغ ——— یعنی ذہنی و فکری تسخیر کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ نگاہیں مغرب کی مادّی ترّقی سے پہلے ہی خیرہ ہو چکی تھیں۔ پھر زندہ قوموں میں ہمیشہ کچھ بنیادی انسانی اوصاف لازماً موجود ہوتے ہی ہیں۔ کچھ ان کی بنا پر مرعوبیت میں اضافہ ہوا۔ نتیجۃً ایک مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ مسلمانانِ عالم کے سوادِ اعظم نے مغربی افکار و نظریات کو جوں کا توں قبول کرنا اور حرزِ جاں بنانا شروع کر دیا ——— خاص فلسفہ و عمرانیات کے میدان میں تو چونکہ خود مغرب میں بے شمار مکاتبِ فکر موجود تھے لہٰذا ان کے بارے میں تو پھر بھی کسی قدر قیل و قال اور ردّ و قدح یا کم از کم ترجیح و انتخاب کا معاملہ کیا گیا لیکن سائنس چونکہ بالکل 'حتمی' اور 'قطعی' تھی اور اس کے نتائج بالکل محسوس و مشہود تھے اور اس میدان میں چون و چرا کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔ لہٰذا اس کا استقبال بالکل وحیِ آسمانی کی طرح ہوا اور اس کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر ملحدانہ نقطۂ نظر اور مادّہ پرستانہ طرزِ فکر رفتہ رفتہ عالمِ اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے ذہنوں میں سرایت کرتا چلا گیا، اور خدا کے بجائے کائنات روح کے بجائے مادّے اور حیاتِ اخروی کے بجائے حیاتِ دنیوی کی اہمیت پوری امّتِ مسلمہ

تھی کہ اس کے خاصے دیندار اور مذہبی مزاج کے لوگوں کے نزدیک بھی مسلّم ہوتی چلی گئی۔

مدافعت کی اوّلین کوششیں اور ان کا ماحصل

مغربی فلسفہ وفکر کی اس یلغار کے مقابلے میں اسلام کی جانب سے مدافعت کی کوششیں بھی اس دوران میں ہوئیں اور بہت سے دردمند اور دین ومذہب سے قلبی لگاؤ رکھنے والے لوگوں نے ان کے تحفّظ کی سعی کی۔ تحفّظ ومدافعت کی یہ کوششیں دو طرح کی تھیں ؛ ایک وہ جن میں محض تحفّظ پر قناعت کی گئی۔ اور دوسری وہ جن میں مدافعت کے ساتھ ساتھ مصالحت اور عجز وانکسار کی روش اختیار کی گئی۔

پہلی قسم کی کوشش وہ تھی جسے بقول مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم اصحاب کہف کی سنت کا اتباع کہا جا سکتا ہے اور جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ زندگی کی شاہراہ سے ہٹ کر کونوں کھدروں میں بیٹھ جاؤ اور اپنے دین وایمان کو بچانے کی فکر کرو۔ اس قسم کی کوششیں اگرچہ بظاہر نری فراریت کا مظہر نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت ان کی اساس خالص حقیقت پسندی اور اس اعتراف پر تھی کہ مغرب کی اس یلغار کے کھلے مقابلے کی سکت اس وقت عالم اسلام میں نہیں ہے لہٰذا ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ یہ کہ اس سیلاب کے راستے سے ہٹ جایا جائے، اور ہر طرح کے طعن واستہزا کو انگیز کرتے ہوئے ایمان کی سلامتی کی فکر کی جائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کامیابی بھی تھوڑی بہت اگر کسی کو ہوئی تو صرف اسی طریق کار کے اختیار کرنے والوں کو ہوئی اور اس کے نتیجے میں امّت کے ایک حصّے کا ایمان بھی سلامت رہ گیا۔ مادّہ پرستی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں روحانیت کی شمعیں بھی کہیں کہیں جلتی رہ گئیں اور قال اللہ تعالیٰ وقال الرسولؐ کی صداؤں میں دین وشریعت کا ڈھانچہ بھی محفوظ رہ گیا ——— ! اس قسم کی کوشش کا مظہر اتم برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعتہً اس کی حیثیت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی ——— !

دوسری قسم کی کوششوں کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ ــــــ زمانے کا ساتھ بھی دیا جائے اور اسلام کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ اس مقصد کے تحت ایک طرف جدید افکار و نظریات کے صحیح و غلط اجزاء کو چھانٹ کر علیحدہ کیا جائے اور دوسری طرف اسلام کی ایسی جدید تعبیر کی جائے جس سے اس کی حقانیت ثابت ہو جائے۔

اس قسم کی کوششوں میں اوّل آوّل مرعوبیت اور شکست خوردگی کے اثرات بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ مغرب کی عقلیت پرستی (RATIONALISM) کی کسوٹی پر ہندو مصر کے کچھ نیم متکلم قسم کے لوگوں نے اسلامی اعتقادات و ایمانیات کو پرکھنا شروع کیا۔ نتیجۃً اسلامی عقائد کی کتر بیونت اور اس کے ماوراء الطبعیاتی اعتقادات کی خالص سائنٹیفک توجیہیں شروع ہوئیں۔ ہندوستان میں سر سید احمد خان مرحوم اور ان کے حلقہ اثر کے لوگوں اور مصر کے مفتی محمد عبدہٗ اور ان کے تلامذہ کی نیتیں کتنی بھی نیک رہی ہوں اور انہوں نے کتنے ہی خلوص کے ساتھ اس کی کوشش کی ہو کہ اسلام کی جدید تعبیر اور ماڈرن توجیہہ کر کے اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکے اور اس کے حلقہ بگوش اسے اپنے ساتھ لے کر ترقی کی اس راہ پر گامزن ہو سکیں جسے یورپ نے اختیار کیا تھا۔ لیکن یہ بہر حال امرِ واقعہ ہے کہ ان کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل کر رہ گئی اور مغرب کی مادّہ پرستانہ ذہنیت کے تحت مذہب کا ایک کم و بیش لامذہبی ایڈیشن تیار ہوا۔ جس کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو صرف یہ کہ بہت سے ایسے لوگوں کو جو ذہن و فکر کے اعتبار سے ہی نہیں تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بھی خالص یورپین بن چکے تھے اپنے اوپر سے اسلام کا لیبل اتارنے کی ضرورت نہ پڑی اور وہ مسلم قومیّت کے حلقے میں شامل رہ گئے اور دین کا یہ جدید ایڈیشن ان کی جانب سے مغرب کی خدمت میں بطور "معذرت" پیش ہو گیا۔

علومِ عمرانی کا ارتقاء

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، مغربی فکر کی اساس خدا، روح اور حیات

بعد الممات کے عدمِ اقرار و انکار کے پردے میں درحقیقت انکار پر تھی۔ چنانچہ ایک طرف تو خدا کے بجائے کائنات اور روح کے بجائے مادہ تحقیق و جستجو کا مرکز و محور بنے جس کے نتیجے میں سائنسی انکشافات و ایجادات و اختراعات کا سلسلہ شروع ہوا ـــــــــ اور دوسری طرف حیاتِ اخروی سرے سے خارج از بحث ہوگئی، اور حیاتِ دنیوی گہرے غور و فکر اور شدید سوچ بچار کا موضوع بنی جس کے نتیجے میں مختلف عمرانی تصورات اور سیاسی و معاشی نظریات وجود میں آئے اور ان کی تالیف و تدوین سے مختلف نظام ہائے حیات پہلے علمی و فکری سطح پر اور پھر عالمِ واقعہ میں ظہور پذیر ہونا شروع ہوئے، چنانچہ ازمنہ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام ـ FEUDAL) SYSTEM) کے تحت جو سیاسی و معاشی ڈھانچہ عرصۂ دراز سے دنیا میں رائج تھا اس کی جگہ سیاسی میدان میں قوم پرستی، آمریت اور جمہوریت کا رواج ہوا اور معاشی میدان میں سرمایہ داری اور سوشلزم برسرِ کار ہوئے اور مختلف سیاسی و معاشی تحریکوں کا آغاز ہوا!

اسلامی نظامِ حیات کا تصور اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں

عمرانیات کے میدان میں مغرب کے اس فکری ارتقاء یا بالالفاظِ صحیح افراط و تفریط کے دھکوں کا اثر عالمِ اسلام پر یہ پڑا کہ یہاں بھی لوگوں نے اسلام پر بطورِ نظامِ زندگی غور و فکر شروع کیا اور اسلام نے حیاتِ دنیوی کے مختلف شعبوں کے لئے جو ہدایات دی تھیں۔ ان کی تالیف و ترتیب سے "اسلامی نظامِ حیات" کی تدوین ہوئی اور ساتھ ہی اس نظامِ زندگی کو دنیا میں عملاً نافذ کرنے کے لئے مختلف ممالک میں تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

بیسویں صدی عیسوی کی یہ اسلامی تحریکیں، جو انڈونیشیا سے مصر تک متعدد مسلمان ممالک میں تقریباً ایک ہی وقت میں شروع ہوئیں۔ بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں اور یہ کہنا بہت حد تک صحیح ہے کہ تقریباً ایک ہی تصورِ دین ان کی پشت پر کام کر رہا ہے اور ایک ہی جذبہ ان میں سرایت کئے ہوئے ہے ـــــــــ پھر یہ

بھی صحیح ہے کہ ان کی وجہ سے عالمِ اسلام میں اسلام پر کم از کم ایک بہتر ضابطۂ حیات ہونے کے اعتبار سے عمومی اعتماد میں اضافہ ہوا ہے اور نوجوان نسل کے ذہنوں سے مغرب کی عالم مرعوبیت میں بحیثیتِ مجموعی کمی واقع ہوئی ہے۔

مغربی فلسفہ و فکر اور تہذیب و تمدّن سے مرعوبیّت میں عمومی کمی کے کچھ دوسرے اسباب بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ مغرب کے سیاسی غلبے اور عسکری تسلّط کا جو سیلاب تیزی سے آیا تھا وہ نہ صرف یہ کہ رُک گیا ہے بلکہ مختلف ممالک میں قومی تحریکوں نے اس کا رُخ پھیر دیا ہے اور مغرب اپنی سیاسی بالادستی کی بساط رفتہ رفتہ تہہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہے[1]۔ اور اگرچہ تحفّظ و حمایت کے پردے میں سیاسی بالادستی اور تعاون و امداد کے پردے میں معاشی تفوّق و برتری کے بندھن ابھی باقی ہیں۔ تاہم تقریباً پُورا عالمِ اسلام مغربی طاقتوں کی براہِ راست محکومی سے آزادی حاصل کر چکا ہے! دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب و تمدّن کا کھوکھلا پن تجربے سے ثابت ہو گیا اور خود مغرب میں محسوس کیا گیا کہ اس کی بنیاد غلط اور تعمیر کج ہے۔ خصوصاً مادہ پرستانہ الحاد جب اپنی منطقی انتہا کو پہنچا اور اس کی کوکھ سے سوشلزم اور کمیونزم نے جنم لیا اور انہوں نے انسانیت کی بچی کھچی اقدار کو بھی "ٹھوس" معاشی مسئلے کے بھینٹ چڑھانا شروع کیا تو خود مغرب پریشان ہو گیا اور وہاں بھی نہ صرف انسانیت بلکہ دبی آواز میں روحانیت تک کا نام لیا جانے لگا۔ تیسرے یہ کہ، نہ صرف یہ کہ خود سائنس کی قطعیت اور حتمیّت ختم ہو گئی اور کچھ نئے نظریات نے نیوٹن کی طبعیات اور اقلیدسی ہندسے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ بلکہ خود مادّہ ٹھوس نہ رہا اور تحلیل ہو کر قوّت محض کی صورت اختیار کر گیا۔ چنانچہ ماوراء الطبعیاتی عقائد کا اقرار "نسبتاً" آسان ہو گیا اور مذہب کو بحیثیتِ مجموعی کسی قدر سہارا ملا۔ چوتھے یہ کہ مختلف مسلمان

---

[1] دولتِ برطانیہ جس طرح رفتہ رفتہ اپنی عظمت کی بساط لپیٹ رہی ہے وہ تو اس دور کا ایک نہایت ہی عبرت آمیز واقعہ ہے۔

ممالک میں جب آزادی اور خود اختیاری کے حصول کے لئے قومی تحریکیں اٹھیں تو چونکہ مسلم قومیت کی اساس بہرحال مذہب پر ہے لہٰذا جذبۂ قومی کی انگیخت کے لیے لامحالہ مذہبی جذبات کو اپیل کیا گیا جس سے احیائے اسلام کے تصوّر کو تقویّت پہنچی۔

مندرجہ بالا اسباب و عوامل سے تقویّت پاکر 'احیائے اسلام'، 'قیامِ حکومتِ الٰہیہ' اور 'نفاذِ نظامِ اسلامی' کی تحریکیں مختلف مسلمان ممالک میں برسرِکار ہوئیں۔ جن میں قوت و وسعت اور جذبہ و امنگ کے اعتبار سے مصر کی 'الاخوان المسلمون' اہم تر تھی لیکن ایک ٹھوس اور مضبوط فکر کی حامل ہونے کے اعتبار سے برّصغیر پاک و ہند کی 'جماعتِ اسلامی' کو نمایاں مقام حاصل تھا۔

یہ تحریکیں تقریباً ثلث صدی سے مختلف مسلمان ملکوں میں برسرِعمل ہیں اور ملّتِ اسلامی کی نوجوان نسل کا ایک خاصا قابلِ ذکر حصّہ ان کے زیرِاثر آیا ہے۔ لیکن عملاً ان میں سے کسی کو کوئی نمایاں کامیابی کہیں حاصل نہیں ہو سکی۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں اپنا وقت پورا کر چکی ہیں اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے خواب کی تعبیر کا وقت ابھی نہیں آیا۔ چنانچہ مصر میں 'اخوان المسلمون' کا اندرونِ ملک تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے، اور اس کے باقیات الصالحات جلاوطنی کے عالم میں دُوَلِ عرب کی باہمی آویزش کے سہارے جی رہے ہیں۔ رہی برّصغیر کی تحریکِ اسلامی تو اس کا جزوِ اعظم پاکستانی سیاست کے نذر ہو چکا ہے اور اب اس کا مقام تحریکِ جمہوریت کی حاشیہ برداری سے زیادہ کچھ نہیں رہا۔

ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بظاہر تو یہ ہے کہ انہوں نے بے صبری سے کام لیا اور اپنے اپنے ملکوں میں سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی اکثریّت کے ذہنوں کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ جس کے نتیجے میں قومی قیادتوں اور 'ترقی پسند' عناصر سے قبل از وقت تصادم کی نوبت آگئی لیکن درحقیقت ان کی ناکامی براہِ راست نتیجہ ہے۔ ان کے تصوّرِ دین کی خامی اور مطالعۂ اسلام کے نقص کا۔

تعبیر کی کوتاہی!

ذرا دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اسی مغربی نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادّے اور حیاتِ اخروی پر حیاتِ دنیوی کو فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ اسلام کے ان ماوراء الطبیعاتی اعتقادات کا جن کے مجموعے کا نام ایمان ہے۔ اقرار تو ان کے یہاں موجود ہے۔ لیکن انہیں کچھ زیادہ درخورِ اعتناء اور لائقِ التفات نہیں سمجھا گیا اور نگاہیں کلیتہً اس ہدایت و رہنمائی پر مرکوز رہیں جو حیاتِ دنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام نے دی ہیں اور جن کے مجموعے کا نام "اسلامی نظامِ زندگی" رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار تو موجود ہے لیکن "ایمان باللہ" کی وہ کیفیت کہ آفاق و انفس میں تنہا وہی فاعلِ مطلق، موثرِ حقیقی اور مسبّب الاسباب "نظر" آنے لگے بالکل مفقود ہے۔ آخرت کا اقرار تو کیا جاتا ہے لیکن اس پر ایسا ایمان کہ "کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ"[1] کی کیفیت پیدا ہو جائے قطعاً ناپید ہے۔ رسالت کا اقرار تو ہے لیکن محبّتِ رسولؐ نام کو موجود نہیں اور مقامِ رسالت کا تصوّر زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو ڈاک کے ہرکارے اور صرف اپنی زندگی میں ملّت کے مرکز یعنی رہبر و مطاع سے زیادہ نہیں، اور جو سنّت کے مقام سے زیادہ آگاہ ہیں انہوں نے بھی سنّتِ عادت اور سنّتِ رسالت کی تقسیم سے ایسا چور دروازہ پیدا کر لیا ہے۔ جس سے کم از کم اپنی نجی زندگیوں کی حد تک زمانے کا ساتھ دینے کی آزادی برقرار رہے! گویا "ایمان" کا صرف وہ اقرار پایا جاتا ہے جو قانونی اسلام کی بنیاد ہے اور یہ کیفیت کہ ایمان انسان کا "حال" بن جائے نہ صرف یہ کہ موجود نہیں ہے بلکہ اس کی کسی ضرورت و اہمیت کا احساس بھی سرے سے عنقا ہے ——!

---

[1] حدیثِ نبوی صلعم :- دنیا میں ایسے رہو جیسے اجنبی یا مسافر!

اسی نقطۂ نظر کا کرشمہ ہے کہ دین اسٹیٹ (STATE) کا ہم معنی قرار پایا ہے اور عبادت اطاعت کے مترادف ہو کر رہ گئی ہے۔ نماز کا یہ مقام کہ وہ معراج المومنین[1] ہے۔ نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے اور نفس انسانی کا اس سے ایسا اُنس کہ "قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ"[2] کی کیفیت پیدا ہو سکے ناپید ہے۔ اس کے برعکس زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو صلوٰۃ معاشرے کے ہم معنی قرار پائی ہے اور دوسروں کے نزدیک بھی اس کی اصل اہمیت اس حیثیت سے ہے کہ وہ مسلمان معاشرے کی اصلاح اور تنظیم کا ایک جامع پروگرام ہے! زکوٰۃ کا یہ پہلو کہ یہ روح کی بالیدگی اور تزکیے کا ذریعہ ہے اس قدر معروف نہیں جتنی اس کی یہ حیثیت کہ یہ اسلامی نظام معیشت کا اہم ستون ہے۔ روزہ کے بارے میں یہ تو خوب بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ضبطِ نفس (SELF CONTROL) کی مشق و ریاضت ہے۔ لیکن اس کی اس حقیقت کا یا تو سرے سے ادراک ہی نہیں ہے یا اس کے بیان میں 'حجاب' محسوس ہوتا ہے کہ یہ روح کی تقویت کا سامان اور جسد حیوانی کی اس پر گرفت کو کمزور کرنے کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ یہ حدیث تو تحریر و تقریر میں عام بیان ہوتی ہے کہ "اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ"[3] اور اس کی تشریح پر خوب زور دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ حدیث قدسی کہ "اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ"[4] اوّل تو کم ہی بیان ہوتی ہے اور اگر باتی بھی ہے تو بس سرسری طور پر[5]۔ اسی طرح حج کے بارے میں یہ تو معلوم ہے کہ اس کے ذریعے "خدا پرستی کے محور پر ایک عالمگیر برادری" کی تنظیم ہوتی ہے لیکن

---

[1] حدیث نبوی صلعم "الصلوٰۃ معراج المومنین": نماز مومنوں کی معراج ہے۔ [2] حدیث نبوی صلعم: میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ [3] حدیث نبوی صلعم: "روزہ ڈھال کے مانند ہے"۔ [4] حدیث قدسی: "روزہ میرے لئے ہے میں خود اس کی جزا دوں گا" یا ایک دوسری قرأت کے مطابق: "روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا ہوں"۔ [5] واقعہ یہ ہے کہ اس حدیث قدسی کے صحیح مفہوم تک رسائی ایسے لوگوں کے بس میں ہے ہی نہیں جن کے دل و دماغ پر مادیت کے پردے پڑے ہوئے ہوں!

اس سے آگے اس کی روحانی برکات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ ؛

اسلام کی یہ نئی تعبیر براہ راست نتیجہ ہے ۔مغرب کے فلسفہ وفکر کے ہمہ گیر تسلّط کا جس نے نقطہ نظر کو ملحدانہ و مادّہ پرستانہ بنا کر رکھ دیا۔ نتیجۃً روح اور اس کی حیات باطنی خارج از بحث ہو گئی ۔ اور مادّہ اور حیات دنیوی ہی سارے غور و فکر کا موضوع اور سوچ بچار کا مرکز بنے ۔چنانچہ دین و مذہب کی بھی مادّی تعبیر ہوئی اور کہنے میں تو اگرچہ یہ آیا کہ اسلام فلاح انسانی کا جامع پروگرام ہے جس میں فلاح اخروی اور فلاح دنیوی دونوں شامل ہیں لیکن نگاہیں چونکہ فی الواقع صرف حیات دنیوی پر مرکوز ہیں ۔لہذا آخری تجزیے میں اسلام ایک "سیاسی و عمرانی نظام" (POLITICO-SOCIAL SYSTEM) —— بن کر رہ گیا —— اور "الٰہیات" کی حیثیت ایک "پردے" سے زیادہ نہ رہی [۱]! چنانچہ زندگی کا اصل مقصد یہ قرار پایا کہ اس نظام زندگی کو عملاً رائج و نافذ کیا جائے ۔رہی خدا کی معرفت و محبّت اور اس کے سامنے تضرّع و اخبات جو 'عبادت' کا اصل جوہر ہیں تو ان کی حیثیت بالکل ثانوی و اضافی ہو کر رہ گئی [۲]۔

---

[۱] : چنانچہ اس دور کے ایک بہت بڑے "متکلم" اور داعیٔ اسلام کا یہ فقرہ ایک ثقہ راوی نے روایت کیا کہ "اسلام دراصل ایک سیاسی و عمرانی نظام ہے جس پر الٰہیات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔" ع

"چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است"!

[۲] : یہ صورت حال بھی خاصی "قدامت پسند" اسلامی تحریکوں' کے یہاں ہے —— ورنہ زیادہ ترقی پسند لوگوں نے تو فکر مغرب کی منطقی انتہا یعنی سوشلزم اور کمیونزم کے زیر اثر اسلام کو سیاسی و عمرانی سے بھی آگے بڑھ کر محض ایک 'معاشی' پروگرام بنا کر رکھ دیا ہے۔ یعنی انکے نزدیک اسلام عبادت ہے محض ایک مخصوص "نظام ربوبیت" سے باقی رہے اعتقادات و ایمانیات تو اُن کے ضمن میں جہاں سرسیّد مرحوم کی انتہا ہوئی تھی وہاں سے انہوں نے ابتدا کی اور جنت و دوزخ کی تعبیر اسی دنیا کے عیش و آرام اور کلفت و مشقت سے اور قیامت کی تعبیر ایٹمی دھماکوں سے کر کے سارا معاملہ ہی ختم کر دیا ۔تاہم باوجود اس کے کہ ہماری نگاہ میں یہ بھی اسلام کی مادّی تعبیر ہی کی 'منطقی انتہا' ہے ۔ مذہب کی یہ تعبیر ہمارا موضوع بحث نہیں اس لئے کہ چاہیے اسے "قرآنی فکر" ہی کا نام کیوں نہ دیا گیا ہو اس کا خالص مادّی اور خلاف قرآن ہونا اظہر من الشمس ہے اور ہم نے اس 'فکر' کی جانب کچھ اشارے کئے بھی ہیں تو محض ضمنی طور پر تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ دین و مذہب کی مادّی تعبیر کا سلسلہ بالآخر یہاں تک جاتا ہے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود دیوار کج!

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں فی الواقع 'مذہبی' سے زیادہ 'سیاسی و عمرانی' اور 'دینی' سے زیادہ 'دنیوی' ہیں۔ اور آخری تجزیے میں دوسری سیاسی و معاشی تحریکوں سے صرف اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ ان کے نزدیک سرمایہ دارانہ جمہوریت یا اشتراکیت بہتر نظام ہائے حیات ہیں اور ان کے نزدیک اسلام انسانی زندگی کے جملہ مسائل کو بہتر طور پر حل کرتا ہے ——— گویا درحقیقت مذہب کی اصل اقدار کے احیاء کا کام تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا؂

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی — کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

یہی سبب ہے کہ یہ تحریکیں بے لنگر کے جہازوں کے مانند ادھر اُدھر بھٹک رہی ہیں اور ان کا حال اکثر و بیشتر اس مسافر کا سا ہے جسے نہ تو منزل ہی کا پتہ رہا اور نہ یہی یاد رہا کہ سفر شروع کہاں سے کیا تھا ؎

ہم تو فانی جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن — غربت جسکو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

'احیائے اسلام' کی شرطِ لازم

'تجدیدِ ایمان'

اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اور احیائے اسلام کا خواب ایمان کی عمومی تجدید کے بغیر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا: مسلمان ممالک کی سیاسی آزادی و خود اختیاری بھی یقیناً بہت اہم ہے اور اس سے بھی ایک حد تک اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار ہوئی ہے اسی طرح اسلامی نظام زندگی کا تصور اور اس پر ایک بہتر نظام حیات ہونے کے اعتبار سے اعتماد بھی ایک حد تک مفید اور قابل قدر ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ پیدا ہوا یا ہو رہا ہے ان کی سعی و جہد بھی احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ لیکن اصل اور اہم تر کام ابھی باقی ہے۔ اور ضرورت اس امر کی ہے کہ عالم اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگ اس امر کی جانب متوجہ ہوں اور جنہیں اس کی اہمیت کا احساس ہو جائے وہ اپنی تمام تر سعی و جہد کو اس پر

مرکوز کردیں کہ امت میں تجدید ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو اور ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر حال کی صورت اختیار کرے :

ایمان لامحالہ کچھ ماوراء الطبیعیاتی حقائق پر یقین کا نام ہے ۔ اور اس راہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اُن دیکھی حقیقتوں پر دکھائی دینے والی چیزوں سے زیادہ یقین رکھنے اور سر کے کانوں سے سنی جانے والی باتوں سے کہیں زیادہ اعتماد ان باتوں پر کرے جو صرف دل کے کانوں سے سنی جا سکتی ہیں ۔ گویا "ایمان بالغیب" اس راہ کی شرطِ اوّلین ہے اور اس کے لیے فکر و نظر کا یہ انقلاب اور نقطہ نظر اور طرزِ فکر کی یہ تبدیلی لازمی و لابدی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی و خیالی نظر آئے لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندہ جاوید حقیقت معلوم ہو ۔ کائنات کا پورا سلسلہ نہ از خود قائم معلوم ہو نہ کچھ لگے بندھے قوانین کے تابع چلتا نظر آئے بلکہ ہر آن و ہر سمت ارادۂ خداوندی و مشیتِ ایزدی کی کارفرمائی محسوس و مشہود ہو جائے ۔ مادّہ حقیر و بے وقعت نظر آئے لیکن روح ایک حقیقتِ کبریٰ معلوم ہو ۔ انسان کا اطلاق اس کے جسدِ حیوانی پر نہ ہو بلکہ اس روحِ ربانی پر کیا جائے جس کی بدولت وہ "مسجودِ ملائکہ" ہوا[1] ——— حیاتِ دنیوی فانی و ناپائیدار ہی نہیں بالکل غیر حقیقی و بے وقعت معلوم ہو اور حیاتِ اخروی ابدی و سرمدی اور حقیقی و واقعی نظر آنے لگے !! اور اللہ تعالےٰ کی رضا اور خوشنودی کے مقابلے میں دنیا و مافیہا کی وقعت حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق مچھر کے پر سے زیادہ محسوس نہ ہو ، یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ جب تک اُمت کے ایک قابلِ ذکر اور مؤثر حصے میں نقطہ نظر کی یہ تبدیلی واقعتہً پیدا نہ ہو جائے "احیائے اسلام" کی آرزو ہرگز شرمندۂ تکمیل

---

[1] آیۂ قرآنی : "فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝" ——— ترجمہ : جب میں اسے پوری طرح بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو گر جانا اس کے لیے سجدے میں ۔

نہ ہو سکے گی۔

عوام کی کشت قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا موثر ترین ذریعہ ایسے اصحاب علم و عمل کی صحبت ہے۔ جن کے قلوب واذہان معرفت ربانی و نور ایمانی سے منور، سینے کبر، حسد، بغض اور ریا سے پاک اور زندگیاں حرص، طمع، لالچ اور حبّ دنیا سے خالی نظر آئیں۔ خلافت علیٰ منہاجِ النبوّۃ کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد ایسے ہی نفوسِ قدسیہ کی تبلیغ و تعلیم، تلقین و نصیحت اور تربیت و صحبت کے ذریعے ایمان کی روشنی پھیلتی رہی ہے۔ اور اگرچہ جب سے مغرب کی الحاد و مادّہ پرستی کے زہر نے مسموم ہواؤں کا زور ہوا ایمان و یقین کے یہ بازار بھی بہت حد تک سرد پڑ گئے تاہم ابھی ایسی شخصیتیں بالکل ناپید نہیں ہوئیں جن کے "دلِ روشن" نور یقین اور "نفسِ گرم" حرارتِ ایمانی سے معمور ہیں۔ اور اب ضرورت اس کی ہے کہ ایمان و یقین کی ایک عام رَو ایسی چلے کہ قریہ قریہ اور بستی بستی ایسے صاحب عزیمت لوگ موجود ہوں جن کی زندگیوں کا مقصدِ وحید خدا کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کا حصول ہو اور جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک کے مطابق کہ لَاَنْ یَّهْدِیَ بِکَ اللّٰهُ رَجُلًا وَّاحِدًا خَیْرٌ لَّکَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ[1] خلق کی ہدایت و رہنمائی کو زندگی کا واحد لائحۂ عمل قرار دے لیں۔ اور اس کے سوا ان کی زندگی میں کوئی اور تمنا، آرزو یا حوصلہ و اُمنگ باقی نہ رہے۔

خوش قسمتی سے برصغیر ہند و پاک میں ایک وسیع پیمانے پر ایسی حرکت پیدا بھی ہو چکی ہے جس کے زیر اثر عوام میں ایمان کی روشنی پھیل رہی ہے اور کائنات سے زیادہ خالقِ کائنات، مادّے سے زیادہ رُوح اور حیاتِ دنیوی سے زیادہ حیاتِ اُخروی کی اہمیت،

---

[1] حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے کسی ایک انسان کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ بہتر ہے۔"

کا احساس اجاگر ہو رہا ہے۔ ہماری مراد جماعتِ تبلیغی سے ہے جسے بجا طور پر تحریکِ دیوبند کی ایک شاخ قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کی تاسیس کچھ ایسے اصحابِ ایمان و یقین کے ہاتھوں ہوئی ہے کہ آج ایک تہائی صدی سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود اس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی، اور اس کے باوجود کہ اس کے طریقِ کار سے ہم کلیتہً اتفاق نہیں کرتے ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس کے زیرِ اثر لوگوں کے طرزِ فکر اور نقطۂ نظر میں ایک ایسی عمومی تبدیلی واقعتہً پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اصل حیثیت کائنات کی نہیں خالقِ کائنات کی ہے اور اصل اہمیت اسباب کی نہیں مسبب الاسباب کی ہے۔ بھوک غذا سے نہیں حکمِ خداوندی سے مٹتی ہے اور پیاس پانی سے نہیں اذنِ باری تعالےٰ سے بجھتی ہے۔ دین کے چھوٹے سے چھوٹے احکام انہیں کسی منطقی استدلال کی بنا پر یا کسی نظامِ زندگی کے اجزا یا اس کو قائم کرنے کے ذرائع کی حیثیت سے نہیں بلکہ فی نفسہٖ خیر نظر آنے لگتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی سے چھوٹی سنتیں بجائے خود نورانی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور زندگی اور اس کے لوازمات کے باب میں کم از کم پر قناعت کر کے وہ اپنے اوقات کا معتدبہ حصہ ایک مخصوص طریق پر تبلیغ و اشاعتِ دین کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔

لیکن چونکہ اس تحریک میں اصل تخاطب عقل سے نہیں جذبات سے ہے اور اس کی اصل اساس علم پر نہیں عمل پر ہے۔ لہٰذا اس کے اثرات محدود ہیں اور معاشرے کے وہ طبقے جن کے یہاں جذبات پر عقل اور عمل پر علم کو اولیت حاصل ہے اس سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ اپنی ذہنی ساخت کی بنا پر مجبور ہوتے ہیں کہ عقل کی جملہ وادیاں طے کر کے عشق کی وادی میں قدم رکھیں اور خرد کی تمام گتھیاں سلجھانے کے بعد صاحبِ جنون ہوں۔ پھر یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اسی قسم کے لوگ ہر دور اور ہر معاشرے کی وہ ذہین اقلیت (INTELLECTUAL MINORITY) — ہوتے ہیں جو از خود معاشرے کی رہنمائی کے منصب پر فائز اور اجتماعیت کی پوری باگ ڈور پر قابض ہوتے ہیں۔ لہٰذا

ان کے نقطہ نظر اور طرز فکر کی تبدیلی اور ان کے فکر و نظر کے انقلاب کو اوّلین اہمیت حاصل ہے ——— اور اگر خدانخواستہ ایمان ان لوگوں کے دلوں میں جاگزیں نہ ہو سکا۔ اور انہیں جہالت وجاہلیت کی ظلمتوں سے نکالا نہ جا سکا تو صرف عوام الناس کے قلوب و اذہان کی تبدیلی سے کسی مؤثر اور پائیدار تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

کرنے کا اصل کام

بنابریں وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک ایسی اٹھے جو سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات اور معاشرے کے ذہین ترین عناصر کے فکر و نظر میں انقلاب برپا کر دے ——— اور انہیں مادیّت و الحاد کے اندھیروں سے نکال کر ایمان و یقین کی روشنی میں لے آئے اور خدا پرستی و خود شناسی کی دولت سے مالا مال کر دے۔ خالص علمی سطح پر اسلامی اعتقادات کے مدلّل اثبات اور الحاد و مادّہ پرستی کے پر زور ابطال کے بغیر اس مہم کا سر ہونا محال ہے۔ ! ساتھ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہیئے کہ چونکہ موجودہ دور میں فاصلے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور پوری نوع انسانی ایک کنبے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ لہٰذا علمی سطح کا تعیّن کسی ایک ملک کے اعتبار سے نہیں بلکہ پوری دنیا کے اعلیٰ ترین معیار کے مطابق کرنا ہو گا ——— اور اگرچہ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ کام انتہائی کٹھن اور سخت محنت طلب ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس کے بغیر اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے خواب دیکھنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔

پیشِ نظر علمی تحریک کے لئے سب سے پہلے ایسے ذہین اور باصلاحیت نوجوانوں کو تلاش کرنا ہو گا۔ جن میں علم کی ایک شدید پیاس فطری طور پر موجود ہو، جن کے قلوب مضطرب اور روحیں بے چین ہوں، جن کو خود اپنے اندر یہ احساس موجود نظر آئے کہ اصل حقیقت حواس کی سرحدوں سے بہت پرے واقع ہے اور جن میں حقیقت کی تلاش و دریافت کا

داعیہ اتنا شدید ہو جائے کہ وہ اس کے لئے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں اور آرام و آسائش کے حصول اور خوشنما مستقبل (CAREERS) کی تعمیر سے یکسر بے نیاز ہو جائیں۔

ایسے نوجوانوں کو اوّلاً انسان کی آج تک کی سوچ بچار کا مکمل جائزہ لینا ہوگا، اور اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ انسانی فکر کی پوری تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں۔ اس اعتبار سے منطق، ماوراء الطبیعات، نفسیات، اخلاقیات اور روحانیات ان کے مطالعہ اور غور و فکر کا اصل میدان ہوں گے۔ (اگرچہ ضمنی طور پر عمرانیات اور طبعیات کی ضروری معلومات کی تحصیل بھی ناگزیر ہوگی) ــ فکرِ انسانی کے اس گہرے اور تحقیقی مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ وحیٔ آسمانی اور اس کے آخری جامع اور مکمل ایڈیشن یعنی قرآن حکیم کا گہرا مطالعہ حقیقت کی تلاش اور حقیقتِ نفس الامری کی دریافت کے نقطۂ نگاہ سے کریں۔

پھر اگر ایسا ہو کہ قرآن کی روشنی اُن پر واضح ہو جائے، اس کا پیغام انہیں اپنی فطرت کی آواز معلوم ہو، اس کے نور سے ان کے قلوب و اذہان منوّر ہو جائیں۔ آفاق و انفس کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں تمام بنیادی سوالوں کا تشفی بخش جواب انہیں مل جائے۔ اور انبساطِ معرفت سے ان کے نفوس میں امن اور سکون و اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جائے ـــــ تو اسی کا نام ایمان ہے ـــ!

پھر یہی ہوں گے جنہیں "رسوخ فی العلم" حاصل ہو گا۔ جن کا علم ذہنی و اخلاقی آوارگی کے بجائے تقویٰ و خشیتِ الٰہی پر منتج ہو گا جن کی شخصیتیں "اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا"[1]

---

[1] آیت قرآنی : اللہ کی خشیت اس کے اہل علم بندوں ہی کے دلوں میں گھر کرتی ہے" ـــ!

کی مجسم تفسیر اور عمر" قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن" کی عملی تصویر ہوں گے۔ اس لئے کہ قرآن کا "مغز" دراصل یہی 'علم حقیقت' ہے جس کا دوسرا نام ایمان ہے۔ قانون و شریعت کی اہمیت بجائے خود اگرچہ نہایت عظیم ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں ان کی حیثیت واقعۃً "استخوان" کی ہے! ——— اور حقیقت یہ ہے کہ اس کیفیتِ ایمانی کی تحصیل کے بغیر قرآن کے بیان کردہ قانونِ شریعت پر غور و فکر بالکل بے کار ہے۔ یہی رمز ہے جو حضرت ابن عباسؓ کے اس قول میں بیان ہوا کہ تَعَلَّمْنَا الْاِیْمَانَ ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرْآنَ [1]

مغرب کے فلسفہ و فکر کے مؤثر ابطال اور اس کی تہذیب و تمدّن کے واقعی استیصال کا کٹھن کام صرف ان لوگوں کے بس کا ہے جو 'علم حقیقت' کے ان چشموں سے اچھی طرح سیراب ہوں جو قرآن حکیم کی آیات بیّنات کی صورت میں رواں ہیں' ان ہی کے لیے ممکن ہو گا کہ وہ آج کے فلاسفہ کے لئے ایک نئی "تہافت" تصنیف کر سکیں اور آج کے منطقیین پہ از سرِ نو "ردّ" کر سکیں، اور فی الجملہ الحاد و مادّہ پرستی کے اس سیلاب کا رُخ پھیر دیں جو تقریباً دو صدیوں سے ذہن انسانی کو بہائے لئے چلا جا رہا ہے!

اس تخریب کے ساتھ انہیں جدید علم الکلام کی تاسیس کا 'مثبت' کام بھی کرنا ہو گا۔ تاکہ ریاضی، طبعیات، فلکیات، حیاتیات اور نفسیات کے میدان میں جن حقائق کی دریافت آج تک ہوئی ہے [2]۔ اور جو اسی حقیقتِ کلّی کی ادنیٰ جزئیات ہیں جن کا مظہر اتمّ ایمان ہے۔ انہیں اسلامی عقائد کے نظام میں اپنے اپنے مقام پر صحیح طور سے فٹ کیا جا سکے۔ آج سے پینتیس چالیس سال قبل علامہ اقبال مرحوم نے "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید" کے سلسلے میں جو کام کیا تھا اس کا وہ حصّہ تو اگرچہ بہت محلّ نظر ہے جو شریعت و قانون اور اجماع

---

[1] ترجمہ: ہم نے پہلے ایمان سیکھا اور پھر قرآن!

[2] واضح رہے کہ اس ضمن میں "حقائق" اور "نظریات" کے مابین فرق و امتیاز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

واجتہاد سے بحث کرتا ہے (اور بجز فی الواقع "الٰہیات" سے براہ راست متعلق بھی نہیں ہے) تاہم اپنے اصل موضوع کے اعتبار سے علامّہ مرحوم کی یہ کوشش بڑی فکرانگیز تھی اور جیسا کہ خود علاّمہ نے کتاب کے دیباچے میں فرمایا تھا کہ ــــــــ "ہو سکتا ہے کہ جیسے جیسے علم آگے بڑھے اور فکر کی نئی راہیں کھلیں، زیرِ نظر کتاب میں جو خیالات بیان ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ بلکہ ان سے صحیح تر خیالات ظاہر ہوں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسانی فکر کے ارتقاء کا ایک آزاد تنقیدی نقطۂ نگاہ سے مسلسل جائزہ لیتے رہیں۔۔۔۔" اگر انہی خطوط پر کام جاری رہتا اور کچھ باہمّت لوگ اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے تو ایک بہت وقیع وقابلِ قدر کام ہو جاتا لیکن افسوس کہ خود علاّمہ مرحوم کے حلقۂ اثر میں سے بھی کسی نے اس میدان کو اپنی جولانیٔ طبع کے لئے منتخب نہیں کیا ـــ!

بہرحال جب تک اس میدان میں واقعی قدر و قیمت رکھنے والا کام ایک قابلِ ذکر حد تک نہیں ہو جاتا یہ اُمید کہ معاشرے کے ذہین طبقات کو مذہب کی طرف راغب کیا جا سکے گا محض سراب کا درجہ رکھتی ہے ــــــ!

"الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید" کے بعد دوسرا اہم کام یہ ہے کہ حیاتِ دنیوی کے مختلف پہلوؤں یعنی سیاست و قانون اور معاشرت و معیشت کے باب میں اسلام کی ہدایت و رہنمائی کو مدلّل و مفصل واضح کیا جائے۔ اس ضمن میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے پچھلے تیس چالیس سال کے عرصے میں خاصا کام مصر اور برّصغیر ہند و پاک میں ہوا ہے۔ خصوصاً جماعت اسلامی اور الاخوان المسلمون نے ـ "اسلامی نظامِ حیات" اور "عدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام" کو تصنیف و تالیف کا مرکزی موضوع بنایا ہے تاہم اس سارے کام کو بس ایک اچھی ابتداء قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور ادھر کچھ عرصہ سے مکھی پر مکھی مار دینے اور تقریباً ایک سی سطح اور ایک سے معیار کی تالیفات مختلف ناموں سے شائع کر دینے کا جو سلسلہ چل نکلا ہے اس نے بہت حد تک اس اساسی کام کی اہمیت بھی ختم کر دی ہے جو بجائے خود خاصا قابلِ قدر تھا۔ اس ضمن میں یہ

بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ نیم خواندہ یا بقول مولانا اصلاحی "پڑھے کم لکھے زیادہ" لوگوں کی تصنیفات و تالیفات کی ایک خاص تکنیک کے ذریعے ایک مخصوص حلقے میں فروخت سے بعض لوگوں کا معاشی مسئلہ تو ضرور حل ہو سکتا ہے۔ دین کی کوئی مثبت اور پائیدار خدمت ممکن نہیں ہے، آج کی دنیا میں خصوصاً اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں رکھنے والے لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ مسلّمہ علمی قابلیت رکھنے والے لوگوں کے سوا کسی مؤلف و مصنف کے جانب التفات کر سکیں۔ لہٰذا لازم ہے کہ جو کام بھی کیا جائے وہ معیاری ہو اور کمیت سے زیادہ کیفیت پیش نظر رہے۔

اس کام کے لئے بھی ظاہر ہے کہ ایک طرف موجودہ دنیا کے مسائل و معاملات کا صحیح فہم اور عمرانیات کے مختلف میدانوں میں جدید رجحانات کا براہِ راست علم ضروری ہے۔ اور دوسری طرف قرآن و سنت میں گہری ممارست لازمی ہے اور جب تک یہ صورت نہ ہو کہ ان دونوں اطراف کا مطالعہ یکساں دِقّتِ نظر کے ساتھ کیا جائے معیاری نتائج کی توقع عبث ہے۔

عملی اقدامات

متذکرہ بالا علمی تحریک کے اجراء کے لیے فوری طور پر دو چیزیں لازمی ہیں۔

ایک یہ کہ عمومی دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا ادارہ قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدید ایمان اور اصلاحِ اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجہ ہوں ان کی ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کرے اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیت ان لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے آرزومند ہیں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوان تلاش کرے جو پیش نظر علمی کام کے لئے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں —— آج کے دور میں، جبکہ مادیت اور دنیا پرستی کا تلاطم

اذہان پر مکمل تسلّط ہے اور کچھ تو فی الواقع طلبِ معاش کا مسئلہ اتنا کٹھن ہو گیا ہے کہ اکثر لوگوں کو اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں اسی کے حل پر مرکوز کر دینی پڑتی ہیں۔ پھر معاشرے کا عام رجحان یہ ہو گیا ہے کہ جو ذرا اس سطح سے بلند ہوتا ہے اس پر معیارِ زندگی کو بلند تر کرنے کی دھن سوار ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے نوجوانوں کا ملنا بظاہر محال نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا سعید روحوں سے کبھی خالی نہیں ہوئی، اور اگر کچھ مخلص و صاحبِ عزیمت لوگ ذہنی یکسوئی کے ساتھ اس کام کا بیڑا اٹھالیں تو انشاءاللہ اسی معاشرے میں بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک نوجوان ایسے مل جائیں گے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک کو کہ خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ [1] اپنا لائحہ عمل بنا کر علم قرآن کی تحصیل و اشاعت کیلئے زندگی وقف کر دیں ـــــــ یہ بھی واضح رہے کہ اصل ضرورت صرف اس کی ہوتی ہے کہ کسی جذبہ و خیال کے تحت انسان میں داخلی طور پر ایک داعیہ بیدار ہو جائے، پھر یہ داعیہ کام کی راہیں خود پیدا کر لیتا ہے اور تمام موانع و مشکلات سے خود نبٹ لیتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ اس خیال کو عام اور اس کی ضرورت کے احساس کو اجاگر کیا جائے پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس اعلیٰ و ارفع نصب العین کے لیے کام کرنے والے دستیاب نہ ہو سکیں۔

دوسرے یہ کہ ایک قرآنی اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جائے ـــــــ جو ایک طرف علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا بندوبست کرے تاکہ قرآن کا نور عام ہو اور اس کی عظمت لوگوں پر آشکارا ہو اور دوسری طرف ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے جو بیک وقت علومِ جدیدہ سے بھی بہرہ ور ہوں اور قرآن کے علم و حکمت سے بھی براہ راست آگاہ ہوں تاکہ متذکرہ بالا علمی کاموں کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔

---

[1] - حدیث نبوی صلعم: "تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔"

فکرِ مغرب کی اساس

اور

اس کا تاریخی پس منظر

مخدومی پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کا مندرجہ ذیل مضمون بظاہر تو ایک خط ہے جو موصوف نے راقم الحروف کے اس مضمون کی تحسین اور تائید کے لیے لکھا ہے جو جون ۱۹۶۷ء کے 'میثاق' میں 'تذکرہ و تبصرہ' کے عنوان کے تحت شائع ہوا تھا۔ لیکن اس نے یورپ کے فلسفہ و فکر کے تاریخی ارتقاء کے موضوع پر ایک جامع اور مبسوط مقالے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انتہاءِ اختصار اور کمالِ جامعیت کے امتزاج کے اعتبار سے یہ تحریر اپنی مثال آپ ہے۔ کاش کہ پروفیسر صاحب کی بعض دوسری ناگزیر مصروفیات نے موصوف کو مہلت دی ہوتی اور وہ اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے لکھ سکتے تو فلسفۂ جدید کے طالب علموں کی رہنمائی کا ایک مستقل سامان ہو جاتا۔ بحالتِ موجودہ بھی ہمیں یقین ہے کہ یہ تحریر فلسفۂ جدید کے بہت سے طلبہ کے لیے انتہائی مفید ثابت ہو گی۔

راقم الحروف کے لیے پروفیسر صاحب نے اپنے اس خط میں جن نیک جذبات کا اظہار فرمایا ہے اس کے لیے وہ ان کا مشکور ہے۔ ساتھ ہی اس تعریف و تحسین پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اللہ سے دعا کرتا ہے کہ وہ اس کے حق میں پروفیسر صاحب کی نیک دعا کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے، اور اسے اپنے دین کی کسی ادنیٰ خدمت کے لیے قبول فرمائے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔

اسرار احمد عفی عنہ

علومِ قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا اہم ترین نتیجہ یہ نکلے گا کہ عام لوگوں کی توجہات قرآن حکیم کی طرف مرکوز ہوں گی، ذہنوں پر اس کی عظمت کا نقش قائم ہوگا، دلوں میں اس کی محبت جاگزیں ہوگی اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہوگا۔ نتیجۃً بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے 'متعارف' ہوں گے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے ایک اچھی بھلی تعداد ایسے نوجوانوں کی نہ نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی کو اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشر و اشاعت کے لیے وقف کر دیں —— ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس اکیڈمی کا اصل کام ہوگا، اور اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ان کو پختہ بنیادوں پر عربی کی تعلیم دی جائے۔ یہاں تک کہ ان میں زبان کا گہرا فہم اور اس کے ادب کا ستھرا ذوق پیدا ہو جائے۔ پھر انہیں پورا قرآن حکیم سبقاً سبقاً پڑھایا جائے، اور ساتھ ہی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم دی جائے —— پھر ان میں سے جو لوگ فلسفہ و الٰہیات کا ذوق رکھنے والے ہوں گے۔ ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ قرآن حکیم کی روشنی میں جدید فلسفیانہ رجحانات پر مدلّل تنقید کریں۔ اور جدید علم الکلام کی بنیاد رکھیں —— اور جو عمرانیات کے مختلف شعبوں کا ذوق رکھنے والے ہوں گے ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام کی رہنمائی و ہدایت کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کر سکیں۔

خوش قسمتی سے قریبی زمانے میں برصغیر میں مولانا حمید الدین فراہیؒ ایسی شخصیت ہو گذری ہے جن نے اپنی پوری زندگی کو قرآن حکیم کے گہرے مطالعے اور تدبّر میں کھپا کر نہ صرف یہ کہ اس کے محلِ تدبّر و تفکر ہونے کو اجاگر کیا بلکہ تدبر قرآن کے کچھ ایسے اصول بھی متعیّن کر دیے جن کی روشنی میں قرآن حکیم پر غور و فکر کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ بھی اللہ تعالےٰ کا بڑا فضل ہے کہ اگرچہ ان کے تلمیذ رشید یعنی مولانا امین احسن اصلاحی کی زندگی کا بہت سا حصہ کچھ دوسرے کاموں کی نذر ہو گیا اور عمر کے اس حصے

ہیں جبکہ قویٰ پر ویسے بھی اضمحلال طاری ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ انہیں پیہم کئی ایسے صدموں سے دوچار ہونا پڑا جن سے اچھے اچھے جوانمردوں کی کمر ہمت بھی ٹوٹ کر رہ جائے تاہم انہوں نے اپنی قوتوں کو از سرِ نو مجتمع کر کے ایک طرف تفسیر تدبر قرآن کی تحریر کا کام شروع کر دیا جس سے نہ صرف یہ کہ خود ان کے اور ان کے استاذ امام فراہیؒ کے زندگی بھر کے مطالعے اور غور و فکر کے ماحصل کے محفوظ ہونے کی صورت پیدا ہو سکے گی بلکہ قرآن پر تدبر کا طریق بھی مزید واضح ہو جائے گا ـــــــــــ اور دوسری طرف کچھ ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا کام بھی شروع کر دیا جو کالجوں سے فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ گویا جدید دنیا سے کسی قدر باخبر اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے ایک حد تک بہرہ ور ہو چکے تھے، اور انہیں عربی زبان کی تعلیم اس حد تک دے کر کہ ان میں ادب کا ذوق پیدا ہو جائے۔ انہیں پورے قرآن حکیم کا درس بھی دیا اور کتب حدیث میں سے صحیح مسلمؒ بھی پڑھائی ـــ اور اس طرح ایک چھوٹے سے پیمانے پر 'حلقہ تدبر قرآن' کی بنیاد رکھ دی ـــ!

اب اگر کچھ باہمت لوگ میدان میں آ جائیں اور اس کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں تو یہی حلقہ تدبر قرآن ایک ایسے مرکز (NUCLEUS) کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ جس کے ارد گرد ایک قرآنی اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جا سکے ـــ اور کالجوں اور یونیورسٹیوں سے فلسفہ و نفسیات، ریاضی و طبعیات اور عمرانیات کے مختلف شعبوں یعنی سیاسیات اور معاشیات وغیرہ کے فارغ التحصیل نوجوان قرآن حکیم کے نور سے اپنے قلوب و اذہان کو منور کر کے اپنے اپنے شعبہ علم میں قرآن کی حکمت و معرفت اور ہدایت و رہنمائی کو خالص علمی انداز میں بنی نوع انسان کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہو سکیں ـــ!

اور اس طرح اس علمی انقلاب کی راہ ہموار ہو سکے جس سے مادہ پرستی اور الحاد کی جڑیں کٹ جائیں اور خدا پرستی و خودشناسی کی دولت عام ہو جائے ـــ اس کے بعد ہی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔

(ج) DIALECTIC MATERIALISM جس کا سب سے پُرجوش حامی اور وکیل MARX ہے

(د) NATURALISM 〃 〃 〃 〃 SANTAYANA 〃

(ه) AGNOSTICISM AND SCEPTICISM 〃 〃 〃 〃 J.S.MILL 〃

(و) EMERGENT EVOLUTION 〃 〃 〃 〃 PLOYD MORGAN 〃

(ز) ATHEISM 〃 〃 〃 〃 MORRIS COHEN 〃

(ح) HUMANISM. 〃 〃 〃 〃 SCHILLER 〃

(ط) REALISM. 〃 〃 〃 〃 MOORE 〃

(ی) PRAGMATISM 〃 〃 〃 〃 DEWY 〃

(ک) LOGICAL EMPIRICISM 〃 〃 〃 〃 CARNAP 〃

(ل) EXISTENTIALISM. 〃 〃 〃 〃 JEAN P.SARTRE 〃

(م) FREUDISM 〃 〃 〃 〃 FREUD 〃

(ن) BEHAVIOURISM 〃 〃 〃 〃 ADLER 〃

(س) COMMUNISM. 〃 〃 〃 〃 LENIN 〃

(ع) SOCIALISM. 〃 〃 〃 〃 LASKI 〃

(ف) LOGICAL ATOMISM. 〃 〃 〃 〃 RUSSELL 〃

(ص) PHYSICAL REALISM. 〃 〃 〃 〃 SELLARS 〃

ان تمام مدارسِ فکر میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ جو شئے حواسِ خمسہ سے محسوس نہ ہو اس کے وجود پر یقین کرنا سراسر حماقت ہے۔ چونکہ خدا، روح اور حیات بعد الموت تینوں غیر محسوس ہیں۔ اس لیے ان کی ہستی پر یقین خلافِ عقل ہے بلکہ یہ تینوں الفاظ مہمل ہیں کیونکہ ان کے مصادیق خارج میں کہیں موجود نہیں ہیں۔

یورپ میں لامذہبیت اور انکارِ خدا کے اسباب کی داستان بہت طویل ہے۔ جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو انہیں حسبِ ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے:۔

1- CONFLICT BETWEEN RELIGION & SCIENCE BY DR. DRAPER.
2- HISTORY OF THE INTELLECTUAL DEVELOPEMENT OF EUROPE BY DR. DRAPER.
3- HISTORY OF THE WARFARE BETWEEN SCIENCE AND THEOLOGY BY WHITE.
4- HISTORY OF EUROPEAN MORALS BY DR. LECKY.
5- HISTORY OF FREE THOUGHTS IN EUROPE BY ROBERTSON.

تاہم قارئین کی خاطر ذیل میں اجمالی طور پر کچھ اشارات درج کیے دیتا ہوں

(ا) جب قیصر روم JUSTINIAN نے یہ دیکھا کہ حکمائے یونان نصرانیت کے خلاف عقل عقائد پر فلسفیانہ اعتراضات کرتے رہتے ہیں تو اس نے تنگ آ کر ۵۲۹ء میں اپنی قلمرو میں فلسفہ اور حکمت کی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا اور تمام فلاسفہ اور حکماء کو جلاوطن کر دیا۔

(ب) اغیار کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد نصرانیوں کی زبان بندی اور ذہنی غلامی کے لیے کلیسائے روم کے اساقفِ اعظم (POPES) نے یہ قانون نافذ کیا کہ جو عیسائی کسی مذہبی عقیدے یا کسی کلیسائی فرمان پر اعتراض کرے گا، اسے کلیسا سے بھی خارج کر دیا جائے گا اور ملعون قرار دے دیا جائے گا۔ یعنی جیتے جی اچھوت اور بعد وفات اس کا لاشہ بے گور و کفن!

(ج) اجانب اور اقارب دونوں کی طرف سے بے فکر ہو جانے کے بعد کلیسائے روم نے خلافِ عقل عقائد (DOGMAS) کے ساتھ حسب ذیل احکام واجب الاذعان بھی

لے مثلاً (ا) تثلیث جس کی رو سے خدا ایک وقت و بیک جہت (باقی اگلے صفحے کے نیچے)

برادرم عزیزم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میثاق ماہ جون ۱۹۶۷ء میں جو خیالات آپ نے تحت "تذکرہ وتبصرہ" سپرد قلم کئے ہیں ان کو پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور آپ کے لیے تہ دل سے دُعا بھی نکلی۔ آپ نے عصرِ حاضر پر جو تبصرہ کیا ہے وہ صحیح ہے ۔ اہلِ مغرب کا ملحدانہ زاویۂ نگاہ ، اس زاویۂ نگاہ کا اہلِ مشرق کے ذہنوں پر تسلّط ، اس کے مضر نتائج ، اس ناگوار صورتِ حال سے رہائی کی تجویز اور اصلاحِ حال کی راہ ۔ ان مباحث پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ بلاشبہ آپ کی اصابتِ فکر ورائے ، معاملہ فہمی ، ژرف نگاہی اور حقائق رسی کا واضح ثبوت ہے ۔ مَیں آپ کو صدقِ دل سے مبارکباد دیتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو جوانی میں بوڑھوں کی سی سمجھ عطا فرمائی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کی دینی اصلاح کی کسی خدمت کے لیے آپ کو منتخب کر لیا ہے اور مَیں دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو خدمتِ دین کی بیش از بیش توفیق بھی عطا فرمائے ۔

مَیں نے بھی نصف صدی تک (از ۱۹۱۷ء تا ایندم) انہی دو تین مسائل پر غور کیا ہے ۔ یعنی مغرب میں الحاد اور مادّیت کے فروغ کے اسباب ، ان مغربی افکار کا اقوام مشرق کے ذہنوں پر تسلّط اور اس تسلّط سے رہائی کی صورت ۔ مجھے آپ کا مضمون پڑھ کر جو غیر معمولی مسرّت حاصل ہوئی ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میرے نتائج افکار اور آپ کے نتائج افکار میں حیرت انگیز مطابقت پائی جاتی ہے ۔ میری رائے میں آپ کی خدمت میں ہدیۂ تحسین پیش کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ مَیں آپ کے بعض دعاوی کو مبرہن اور مدلّل کر دوں ، بعض حقائق کی وضاحت کر دوں ، بعض صداقتوں کو مؤکّد کر دوں اور بعض تجاویز کو مشیّد کر دوں ۔

۱۔ آپ نے لکھا ہے :

"موجودہ دَور بجا طور پر مغربی فلسفہ وفکر اور علوم وفنون کی بالادستی کا دَور ہے اور آج پورے کرۂ ارض پر مغربی افکار ونظریات بر انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصوّرات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن

کی ابتدا آج سے دو سو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی" نیز یہ کہ "مغربی تہذیب و تمدّن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلّط بہت شدید اور ہمہ گیر ہے"۔

آپ کا یہ تبصرہ بالکل صحیح ہے چنانچہ میرے اور علّامہ اقبالؒ دونوں کے معنوی مرشد، لسان العصر اکبر الٰہ آبادی نے آج سے پچاس سال پہلے انہی حقائق کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں یوں بیان کر دیا تھا:۔

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردّی
بُدّھو اکڑ رہے ہیں "صاحب نے یہ کہا ہے"

اور :۔
چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پائنیر میں چھپے

۲۔ آپ نے لکھا ہے :۔

"لیکن اس پورے ذہنی اور فکری سفر کے دوران ایک نقطۂ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پہ اس پورے فکر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں خیالی اور ماورائی تصورات کے بجائے ٹھوس حقائق کو غور و فکر کا اصل مرکز ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات، روح کے بجائے مادّہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصوّر کے بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوعِ بحث قرار دیا گیا ہے"۔

یہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے، حرف بحرف صحیح ہے۔ آج مغرب شدید نوعیت کے الحاد اور انکارِ خدا کی لعنت میں گرفتار ہے چنانچہ آج مغرب میں منطقی ایجابیت ــــ (LOGICAL POSITIVISM) کا فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے اور اس کے علاوہ جو مدارسِ فکر مقبول ہیں وہ بھی سب کے سب انکارِ خدا و روح و آخرت پر مبنی ہیں اور خالص مادّیت کے حامی اور مبلّغ ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) THE PHILOSOPHY OF "AS IF" جس کا سب سے پرجوش حامی اور وکیل VAHINGER ہے
(ب) PHENOMENALISM " " " " HUSSREL "

نافذ کر دیئے :۔

۱۔ معیارِ حق و باطل بائبل نہیں ہے بلکہ کلیسا ہے اور کلیسا سے مراد ہے پوپ اور اس کے ماتحت مذہبی پیشواؤں کی جماعت۔

۲۔ ہر پوپ، معصوم عن الخطاء اور مطاع ہے اس لیے اس کے احکام میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔

۳۔ مذہب اور مذہبی عقائد میں عقل کو مطلق دخل نہیں ہے۔

بجا کہے جسے پاپا، اسے بجا سمجھو
زبانِ پوپ کو نقّارۂ خدا سمجھو!

۴۔ کلیسائی روایات کا انکار بھی کفر ہے۔

وبیک حیثیت و بیک اعتبار ایک بھی ہے اور تین بھی ہے نیز وحدت بھی حقیقی ہے اور تثلیث بھی حقیقی ہے۔

(ب) تجسّم جس کی رو سے کلام (LOGOS) جو خدا کے ساتھ بھی ہے اور خدا بھی ہے مجسّم ہو کر یسوع کی شکل میں ظاہر ہوا۔

(ج) یسوع نے، اگرچہ وہ خدا تھا اور خدا کی صورت میں تھا، بوجہ غایت فروتنی (HUMILITY) اپنے آپ کو الوہیت سے معرّیٰ کر دیا اور غلام کی حیثیت اختیار کر لی اور صلیبی موت گوارا کر لی۔

(د) یسوع مسیح نے مصلوب ہو کر قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے پیدائشی گناہوں کا کفّارہ ادا کر دیا۔

(ﮦ) جب پادری، عشاء ربانی کے وقت روٹی اور شراب پر یسوع کا نام لے کر دعا کرتا ہے اور اسے اپنے ہاتھ سے متبرک کر دیتا ہے تو وہ روٹی یسوع کا جسم اور شراب، یسوع کا خون بن جاتی ہے۔ اس ناقابلِ فہم عمل کو اصطلاح میں (TRANSUBSTANTIATION) کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا ترجمہ ہوگا استحالۂ جوہری یا انقلابِ ذات۔

۵ - پوپ اور کلیسا کو گناہ معاف کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

۶ - کلیسا کے علاوہ کسی شخص کو بائبل لکھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

(د) تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں اندلس کے مشہور فلسفی ابن رشد (متوفی ۱۱۹۸ء) کی تمام تصانیف کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوگیا اور پندرہویں صدی میں ان کی تمام تصانیف اٹلی اور فرانس کی یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہوگئیں۔ ان تصانیف کی بدولت یورپ ایک ہزار سال کے بعد ارسطو کے فلسفے سے واقف ہوا اور اس کی وجہ سے یورپ میں سولہویں صدی میں دو تحریکیں رونما ہوئیں جن کا نام "احیاء العلوم" اور "اصلاح کلیسا" ہے۔ چنانچہ رومن کیتھولک کلیسا، جس کے خلاف لوتھر نے صدائے احتجاج بلند کی اس بات کا معترف ہے کہ لوتھر بڑی حد تک ابن رشد کے فلسفے سے متاثر ہوا تھا۔ میری تحقیق بھی یہی ہے کہ لوتھر کے دماغ میں کلیسا کی اصلاح کا خیال ابن رشد کی تصانیف کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا۔

قصہ مختصر سولہویں صدی میں حسب ذیل پادریوں نے جو رومی کلیسا سے وابستہ تھے، کلیسا کی چیرہ دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ERASMUS م ۱۵۳۶ء ZIVINCLI م ۱۵۳۱ء LUTHER م ۱۵۴۶ء MOLANCTHON م ۱۵۶۱ء اور CALVIN م ۱۵۶۴ء۔ ان کا سربراہ لوتھر تھا اس نے یہ اعلان کیا کہ بائبل کی صداقت کا دار و مدار کلیسا پر نہیں ہے (جیسا کہ کلیسا کہتی تھی) بلکہ خود کلیسا کی صداقت کا دار و مدار بائبل پر ہے یعنی معیار حق و صداقت بائبل ہے نہ کہ پوپ یا کلیسا۔

لوتھر اور اس کے ہمنواؤں کے احتجاج (PROTEST) کا نتیجہ یہ نکلا کہ رومن کیتھولک مذہب کے مقابلے میں یورپ میں پراٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوگیا اور کلیسا کا اقتدار بڑی حد تک ختم ہوگیا۔

تحریک احیاء العلوم کی بدولت یورپ میں فلسفے (خصوصاً فلسفۂ ارسطو) کے مطالعے کا ذوق از سر نو زندہ ہوگیا اور جب اس کی بدولت یورپ کو عقلی آزادی نصیب ہوئی تو سترھویں صدی میں سائنس کا دور شروع ہوا جو آجکل بیسویں صدی میں اپنے

نقطۂ عروج کو پہنچا ہوا ہے۔

(ط) اہلِ سائنس اور اہلِ فلسفہ دونوں نے کلیسائیت اور نصرانیت کے خلافِ عقل عقائد پر اعتراضات وارد کیے۔ کلیسا اور نصرانیت دونوں ان کے جوابات سے قاصر اور عاجز تھیں۔ اس لیے انہوں نے معترضین کو کلیسا اور مذہب دونوں سے خارج کر دیا۔

کلیسا سے دوسری غلطی یہ ہوئی کہ اس نے سائنس کی تحقیقات کو بھی مذہب کے خلاف قرار دے دیا مثلاً جب کاپرنیکس اور گلیلیو نے یہ کہا کہ زمین گول ہے اور آفتاب کے گرد گھوم رہی ہے تو کلیسا نے کہا یہ باتیں مذہب کے خلاف ہیں اور ان کے قائلین کافر ہیں

(ی) کلیسا کی عقل دشمنی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سائنس اور مذہب میں جنگ شروع ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ حکما اور فلاسفہ نے مذہب کو خیرباد کہہ دیا اور اس طرح یورپ میں لامذہبیت کا آغاز ہو گیا۔

اٹھارہویں صدی کے نصفِ اوّل میں (HUME) نے لاادریت کا فلسفہ پیش کیا اور عقلی دلائل سے ثابت کیا کہ عقلِ انسانی، خدا کی ہستی کا اثبات نہیں کر سکتی۔ ہیوم کے اس فلسفے کو کانٹ (KANT) نے ۱۷۸۱ء میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا اور اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "تنقیدِ عقلِ خالص" میں خدا کی ہستی پر جو دلائل فلاسفہ نے مدون کئے تھے، ان سب کا ابطال کر دیا، اور اس طرح انکارِ خدا کی راہ ہموار کر دی۔

انیسویں صدی میں مشہور منطقی سر ولیم ہیملٹن اور مشہور عالم الٰہیات ڈاکٹر مینسل نے ہیوم اور کانٹ کے نظریات کی یہ کہہ کر مزید تائید کر دی کہ ذہن انسانی خدا کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتا۔ ان کے بعد مِل اور اسپنسر نے اپنے فلسفۂ لاادریت سے مذکورہ بالا حکماء کے نظریات کو تقویت پہنچائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انکارِ خدا کا عقیدہ خواص اور عوام دونوں کے دماغوں میں جاگزیں ہو گیا۔

جب یورپ کو کلیسا اور پوپ کی غلامی سے نجات ملی تو حکما اور فلاسفہ نے نفسِ مذہب کے ساتھ ساتھ نصرانیت اور کلیسائی عقائد کو بھی ہدفِ تنقید بنایا اور انیسویں صدی میں ان کی تنقید اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ چنانچہ اس صدی کے نصفِ اوّل میں مشہور

جرمن فاضل اور محقق اسٹراس (STRAUSS 1808-1874) نے ۱۸۳۵ء میں حیات یسوع (LEBAN JESU) لکھ کر کلیسا کے ایوان میں زلزلہ ڈال دیا۔ اس عہد آفرین کتاب میں اس نے اس بات کو مبرہن کیا کہ یسوع کی شخصیت تاریخی طور پر ثابت نہیں ہو سکتی نیز یہ کہ یسوع تو قدیم دیوتا متھرا کا مثنی ہے اور جو مذہب اس کے نام سے منسوب ہے وہ متھرا ئیت کا چربہ ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ولیم کرٹس ہیکر پروفیسر تاریخ کلیسا نے اپنی تصنیف تاریخ کلیسا میں اس کتاب کو "THE MOST EPOCH-MAKING BOOK" عظیم ترین عہد آفریں کتاب قرار دیا ہے۔

۱۸۴۱ء میں ہیگل کے مشہور شاگرد فیور باخ (م ۱۸۷۲ء) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب THE ESSENCE OF CHRISTIANITY شائع کی جس میں اس نے عیسائی مذہب اور اس کے تصوّر ذات باری دونوں کا ابطال کر دیا۔

۱۸۶۳ء میں فرنچ فاضل ارنسٹ رینان (م ۱۸۹۲ء) نے حیات یسوع (VIE DE JUSUS) لکھی جس میں اس نے یہ ثابت کیا کہ یسوع محض ایک انسان تھا۔

پروفیسر بور (F.C. BAUR) نے بائبل کی کتابوں پر تنقید کی اور ثابت کیا کہ پولوس کے خطوط میں سے صرف تین اصلی ہیں باقی سب جعلی ہیں اس لیے بائبل بحیثیت مجموعی قابل اعتماد نہیں ہے۔

(ن) میں نے بخوف طوالت چند نقادوں کے تذکرے پر اکتفا کیا ہے۔ میرا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اس تنقید کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پہلے مذہب عیسوی اور اس کے بعد نفس مذہب بھی پایۂ اعتبار سے ساقط ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کو اس بات سے بھی بہت ضعف پہنچا کہ یورپ میں جو فلسفہ ـــ اور اس سے میری مراد فلسفہ تصوریت (IDEALISM) ہے، مذہب کا حامی تھا، انیسویں صدی میں اس پر چاروں طرف سے اعتراضات شروع ہو گئے اور اس کے زوال کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلسفے کے میدان میں

مذہب کا کوئی مددگار باقی نہ رہا اس کی تفصیل یہ ہے :-

انیسویں صدی میں کارل مارکس نے اپنے فلسفہ اشتراکیت کو مسلک مادّیت کی اساس پر قائم کیا جو خدا اور روح دونوں کا منکر ہے۔

ڈارون نے نظریۂ ارتقا پیش کیا جس سے مسلک مادّیت کو تقویت حاصل ہوئی۔

شوپن ہاور نے نظریۂ قنوطیت (PESSIMISM) کی اشاعت کی اور یہ نظریہ بھی خدا اور مذہب کا مخالف ہے۔

مل اور اسپنسر نے مسلک لاادریت کی تبلیغ کی اور یہ مسلک بھی مذہب اور خدا کے بارے میں شکوک پیدا کرتا ہے۔

نطشہ (NEITZSCHE) نے بھی اپنے فلسفے میں خدا کا انکار کیا اور ANTI — CHRIST لکھ کر عیسائیت پر کاری ضرب لگائی۔

بیسویں صدی میں وجودیت (EXISTENTIALISM) اور منطقی اثباتیت (LOGICAL POSITIVISM) نے مادّیت کو تقویت پہنچائی اور جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں آج یورپ میں آخرالذکر فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے جس کی رو سے خدا، روح اور آخرت تینوں الفاظ قطعاً مہمل اور بے معنی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ بریڈلے (م ۱۹۲۴ء) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب مظاہر اور حقیقت (APPEARANCE AND REALITY) میں مادّیت کی پورے طور سے تردید کر دی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر رشید ڈل نے اپنی تصنیف "فلسفہ اور مذہب" میں میرے قول کی ہاں الفاظ تائید کی ہے۔ "مسٹر بریڈلے نے اپنی تصنیف کے ابتدائی ابواب میں مادّیت کے مقابلے میں تصوریت کی جس انداز سے حمایت کی ہے اس کی تردید نہیں ہو سکتی۔" (ص ۲)

لیکن یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ عصرِ حاضر میں الحاد پرور سائنس اور ملحدانہ مدارس فلسفہ کو جو قبول عام کی سند حاصل ہو گئی ہے اس کی وجہ سے فلسفہ تصوریت جو مادّے کے مقابلے میں روح کو اصل کائنات اور حقیقت اقصٰی قرار دیتا ہے، غیر مقبول ہو چکا ہے آج کی دنیا میں حکماء اور فلاسفہ کی اکثریت کا میلان مادّیت کی طرف ہے اور مذہب کی

اپیل بہت کمزور ہوگئی ہے اور سائنٹفک نظریات نے بہت سے مذاہب کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے۔

عصر حاضر میں پانچ مدارسِ فکر بہت مقبول ہیں۔ اور سب کے سب الحاد پرور ہیں۔ اور انکار خدا و روح پر مبنی ہیں یعنی :۔

1 - PLURALISTIC REALISM

2 - DIALECTIC MATERIALISM.

3 - EXISTENTIALISM.

4 - NATURALISM

5 - LOGICAL POSITIVISM.

اور ان میں آخر الذکر فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔

خلاصۂ کلام یا رجحانِ عصرِ حاضر

قصہ مختصر خدا اور مذہب کے بارے میں جو شکوک اور شبہات جدید تعلیم یافتہ طبقے کے افراد میں پائے جاتے ہیں، ان کے اسباب یہ ہیں :۔

(ا) سائنٹیفک اسپرٹ (روح) کی روز افزوں نشوونما اور آبیاری۔

(ب) ٹیکنولاجیکل تہذیب کی ترقی۔

(ج) مادی علوم و فنون کا عروج۔

(د) ایجادات کی بدولت تسخیرِ عناصر کائنات کا سلسلہ۔

(ہ) لذاتِ جسمانی اور ترغیباتِ جنسی کی روز افزوں فراوانی اور بوقلمی۔

ان عناصر سے انسان کا نقطۂ نظر سراسر مادی ہوگیا ہے اور اس کا اثر حیات کے ہر شعبے پر مرتب ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنسی فتوحات نے انسان کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے[1]

---

[1] نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی   یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے (اقبال)

خدا سے بے نیازی کی ابتداء تو کاپرنیکس ہی کے عہد سے شروع ہو چکی تھی اسی لیے لاپلاس (LA PLACE م ۱۸۲۷ء) نے نپولین کے سوال کے جواب میں یہ عہد آفریں جواب دیا تھا کہ "میں نے اپنی تصنیف 'توضیح نظام کائنات' میں خدا کا ذکر محض اس لئے نہیں کیا کہ عقل کی مدد سے کائنات کا نظام خدا کے بغیر بھی بخوبی مدون ہو سکتا ہے۔" اور اسی لیے بیسویں صدی میں اقبال کے استاد میک ٹیگرٹ[۲] (م ۱۹۲۵ء) نے جب اپنا فلسفۂ خودی ONT-OLOGICAL IDEALISM کے عبیر الفہم عنوان سے مرتب کیا تو انسانی خودی کو حقیقت (REALITY) تسلیم کرنے کے بعد خدا کو اپنے نظام فکر سے بکلّی خارج کر دیا۔

فزیکل سائنس ہر لمحے ہماری حیاتِ اجتماعی و انفرادی کو متاثر کر رہا ہے۔ بخصوصاً ہمارے مدارس فلسفہ ہمارے مذاہب اور حیات و ممات سے متعلق ہمارے عمومی زاویۂ نگاہ پر تو نمایاں اور ناقابلِ تردید اثر مرتب ہوا ہے۔

جدید سائنس کی رو سے حیاتِ عضوی کی توجیہہ محسوس فطری قوانین کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ اس کے لئے کسی فوق الفطرت طاقت کا سہارا نہیں لیا جاتا اور اس سائنٹیفک توجیہہ کی رو سے انسان فاعل مختار (FREE MORAL AGENT) نہیں ہے۔

اسی طرح جدید نفسیات کی رو سے انسان اپنی ذات کا مالک نہیں ہے۔ نفسِ انسانی کی باشعور زندگی پر اس کی حیوانی جبلتوں کی حکومت ہے جو اس کے لاشعور میں پوشیدہ ہیں۔ فرائڈ یہ بھی کہتا ہے کہ ارادہ و مشیّت کی آزادی دراصل ایک خود پسندانہ فریبِ نفس ہے۔ انسانی شخصیّت کا تعین خارجی ماحول سے ہوتا ہے۔ جیسا ماحول مل گیا ویسا ہی انسان بن گیا۔

فلسفۂ اخلاق بھی سراسر مادّی بنیادوں پر استوار کر دیا گیا ہے۔ پروفیسر ڈیوی

---

[۲] اقبال نے ۱۹۳۵ء میں اپنے استاد کے سوانح حیات پڑھ کر اس کی یاد میں ایک مختصر سا مضمون لکھا تھا اور اس کے آغاز میں اسے "PHILOSOPHER-SAINT" "فلسفی ولی" کے لقب سے نوازا تھا۔

لکھتا ہے کہ "اخلاقی اقدار بھی اُسی طرح غیر مستقل اور بے ثبات ہیں جس طرح بادل۔ مستقل (ازلی) اقدار کا تصوّر محض خوش فہمی ہے"۔ رہے مسائلِ مابعد الطبیعات تو ان کے متعلق منطقی اثباتیت (LOGICAL POSITIVISM) کا فتویٰ یہ ہے کہ جو شئے حواسِ خمسہ سے محسوس نہ ہو وہ ناقابلِ التفات ہے۔ کائنات اور حیاتِ انسانی کے بارے میں سائنس اور فلسفۂ مادّیت کا قولِ فیصل یہ ہے کہ یہ دونوں بے مقصد ہیں۔ انسان کی تقدیر یہ ہے کہ وہ پیدا ہو، کھائے پیئے، افزائشِ نسل کرے اور آخر کار مر کر ہمیشہ کے لیے فنا (معدوم) ہو جائے۔ الغرض جدید سائنس اور فلسفے کی روح، مذہب کے خلاف ہے۔

یہ ہے مختصر طور پر آپ کے مضمون کے ابتدائی حصّے کی توضیح۔ میں نے نہایت اختصار کو مدّنظر رکھا ہے ورنہ یہ موضوع اس قدر وسیع الذیل ہے کہ اس پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "اس قسم کی کوشش کا مظہرِ اتمّ برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعۃً اس کی حیثیت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی"۔ نیز یہ کہ "یہ امر واقعی ہے کہ اُن (سرسیّد) کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل گئی اور مادّہ پرستانہ ذہنیت کے تحت مذہب کا ایک لامذہبی ایڈیشن تیّار ہوا"۔ میں آپ کے اخذ کردہ ان نتائج سے بالکل متفق ہوں۔ سرسیّد نے مذہب کے درخت میں مغربی فلسفے کا جو پیوند لگایا ہے اس کے اثمارِ تلخ سے پاکستانی مسلمانوں کے کام و دہن بقدرِ ذوق خوب لذت اندوز ہو رہے ہیں۔ "دنیا ئے اسلام" میں آپ کے مسلمان ابھی سے اس تلخی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔ انہیں کون بتلائے کہ ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "ان تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اسی مغربی مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادّے کو اور حیاتِ اخروی پر حیاتِ دنیوی کو فوقیّت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اقرار تو موجود ہے لیکن ایمان باللہ کی وہ کیفیّت کہ انفس اور آفاق

میں تنہا وہی فاعلِ مطلق، مؤثرِ حقیقی اور مسبّب الاسباب نظر آنے لگے، بالکل مفقود ہے۔۔
رسالت کا اقرار تو موجود ہے لیکن محبت رسولؐ نام کو موجود نہیں ہے"

میں آپ سے بالکل متفق ہوں اور آپ کو اس حقائق رسی، ژرف نگاہی اور معرفت نگاری پر داد دیتا ہوں۔ سچی بات یہی ہے کہ جب تک ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کو فاعلِ حقیقی اور مؤثرِ حقیقی نہ سمجھے وہ قرآنی توحید کے مقام پر فائز نہیں ہو سکتا۔ اسلامی تصوف جسے جاہل صوفیوں نے بدنام کر دیا، دراصل توحید ہی کو دل و دماغ میں جاگزیں کرنے اور اسے زندگی میں ایک عاملِ مؤثر بنانے اور اس کے تقاضوں پر عمل کے لیے آمادہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانی[1] اپنی تصنیف فتوح الغیب کے تیسرے مقالے میں فرماتے ہیں کہ "اے بیٹے اس بات کو حرزِ جان بنا لے کہ لا فاعل فی الحقیقت ولا مؤثر فی الحقیقت الا اللہ" واحسرتا! آج شیخ موصوف کے نام پر گیارہویں کی نیاز کرنے والے تو لاکھوں ہیں مگر ان کی تعلیم پر عمل کرنے والا ایک بھی نظر نہیں آتا۔ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جس بزرگ نے پچاس برس تک مسلمانوں کو یہ تلقین کی ہو کہ اللہ کے سوا کوئی دستگیر نہیں، کوئی مشکل کشا نہیں، کوئی حاجت روا نہیں، آج اس کے نام لیوا خود اسی کو دستگیر اور مشکل کشا سمجھتے ہیں اور اللہ کے بجائے اسی کو پکارتے ہیں۔

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "ضرورت اس امر کی ہے کہ اُمّت میں تجدیدِ ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو تاکہ ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر 'حال' کی صورت اختیار کر لے"
میں اس باب میں آپ سے بکلّی متفق ہوں۔ اقبال نے اسی بات کو یوں ظاہر کیا ہے

---

[1] شیخ موصوف ۴۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ بیس سال کی عمر میں دینی علوم سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد بیس سال تک اپنے مرشد کے زیرِ تربیت رہ کر تزکیۂ نفس کرتے رہے، چالیس سال کی عمر میں مرشد کے حکم سے تلقین و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور پچاس سال تک مسلمانوں کو توحید کا درس دیتے رہے اور طالبانِ حق کی رہنمائی کرتے رہے۔ ۵۶۱ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ ؎
رحمتِ ایزدی بر روحش باد!

بالفاظ دگر انہوں نے بھی یہی علاج تجویز کیا ہے :-

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں میں ہمیں یہی انقلاب نظر آتا ہے کہ عقیدۂ توحید ان کا حال بن گیا تھا اسی انقلاب کا یہ نتیجہ تھا کہ "انہیں یہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی اور خیالی نظر آتی تھی لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہوتی تھی۔" وہ جس طرف کو منہ کرتے تھے انہیں اللہ ہی نظر آتا تھا اور وہ ہر واقعے میں اللہ ہی کو کارفرما دیکھتے تھے۔ اکبر الہ آبادی نے ذیل کے شعر میں یہی اندازِ نگاہ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔

ارشاد ہے کہ شرک نہ کر اور نماز پڑھ
مطلب یہ ہے کسی کو نہ دیکھ اور ہمیں کو دیکھ

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "ایمان بالغیب کے لیے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی یہ تبدیلی لازمی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی و خیالی نظر آئے۔ لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہو ... حیاتِ دنیوی فانی ہی نہیں بالکل غیر حقیقی اور بے وقعت معلوم ہو اور حیاتِ اخروی حقیقی اور واقعی نظر آنے لگے جب تک اُمت کے ایک قابلِ ذکر حصے میں نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی رونما نہ ہو، احیائے اسلام کی آرزو ہرگز ہرگز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے گی۔" میں آپ کی اس بات سے بکلّی اتفاق کرتا ہوں بلکہ میری دلی آرزو یہ ہے کہ اللہ آپ کو توفیق دے کہ آپ اس صداقتِ عظمیٰ کو پاکستان ہی نہیں تمام دنیائے اسلام میں شائع کر سکیں اور ہر مسلمان تک پہنچا سکیں۔ میں پچاس برس کے غور و فکر کے بعد جس نتیجے پر پہنچا، اللہ نے آپ کو دس پندرہ سال کے غور و فکر کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا دیا اور مزید کرم یہ کیا کہ اسے پیش کرنے کی سعادت بھی آپ کو عطا فرمائی۔

بیسویں صدی میں مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے جو تحریکیں ہندوستان اور دوسرے اسلامی ملکوں میں برپا ہوئیں وہ سب میری نگاہوں کے سامنے ہیں اور میں نے اپنی آنکھوں سے ان تحریکوں کو ناکام ہوتے دیکھا ہے۔ سبب اس ناکامی کا وہی ہے جو آپ نے بیان کیا

ہے کہ جن لوگوں نے یہ تحریکیں برپا کیں ان میں بنیادی نقص یہ تھا کہ اللہ کے ساتھ ان کا تعلق محض قال تک محدود تھا بالفاظِ دگر وہ اسلام کا نام تو لیتے تھے، مگر اس کی روح سے بیگانہ تھے۔ اسلام کی روح، جیسا کہ میں سمجھا ہوں محض ارکانِ اسلام کی رسمی پابندی نہیں ہے بلکہ دل کی آنکھوں سے اللہ عزوجل کا مشاہدہ یا اُس ذاتِ پاک کے ساتھ ایسا شدید قلبی رابطہ ہے جو مسلمان کو اس مقام پر پہنچا دے جہاں پہنچ کر ہر وقت اللہ ہی پیشِ نظر رہتا ہے۔ غیر اللہ کی ہستی کالعدم ہو جاتی ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے" عوام کے قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا موثر ترین ذریعہ ایسے اصحابِ علم وعمل کی صحبت ہے جن کے قلوب اور اذہان معرفتِ ربانی سے منور ہوں اور سینے، کبر وحسد، بغض وعناد سے پاک ہوں اور زندگیاں حرص وطمع اور حبِ دنیا سے خالی ہوں"۔

میں اس معاملے میں بھی آپ سے کلّی متفق ہوں، از راہِ تفاخر نہیں بلکہ بطور اظہارِ حقیقت یہ بات لکھ رہا ہوں کہ میں نے پچاس سال سے زائد عرصہ منطق، فلسفہ، الٰہیات اور علم کلام کے مطالعے میں ضائع کیا لیکن خدا گواہ ہے کہ نہ تو ان علوم وفنون سے اللہ کے ساتھ تعلق پیدا ہوا اور نہ کتابوں سے کبر وحسد، بغض وریا اور حرص وطمع کا ازالہ ہوا۔ ان امراضِ خبیثہ کا ازالہ تو کیا ہوتا الٹا میرا دماغ شکوک وشبہات کی جولانگاہ بن گیا اور اگر اس عالمِ پیری میں (سن ولادت ۱۳۱۳ھ) توفیقِ ایزدی تصوّف کے نخلستان میں نہ پہنچا دیتی تو آج تشکیک کے ریگستان میں العطش العطش پکارتا ہوتا۔ شکر ہے کہ وفات سے پہلے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی کہ

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا (اکبرؔ)

سچ کہا ہے شیخ سعدیؒ نے:۔

جز یادِ دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است | جز حرفِ عشق ہر چہ بخوانی بطالت است
سعدی بشوئے نقشِ دوئی را ز لوحِ دل | علمے کہ راہِ حق نہ نماید جہالت است

نیز سچ کہا ہے مرشدِ رومیؒ نے:۔

علم چہ بود؟ آنکہ رہ بنمایدت ۔۔۔ زنگِ گمراہی ز دل بزدایدت
علم بنود غیرِ علمِ عاشقی ۔۔۔ مابقی، تلبیسِ ابلیسِ شقی

یہ صحبت ہی کا تو ثمرہ تھا کہ ابنِ ابی قحافہؓ، صدیق اکبرؓ کے مقام پر فائز ہو گئے او
یہ صحبت ہی کا تو کرشمہ تھا کہ ابنِ خطابؓ کو فاروقِ اعظمؓ کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ رضی اللہ عنہم
اسی لیے اقبالؔ نے یہ کہا:۔

صحبت از علمِ کتابی خوشتر است
صحبتِ مردانِ حر، آدم گر است
دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

پھر آپ نے لکھا ہے کہ" وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک اٹھے جو تعلیم یافتہ طبقات اور ذہین افراد میں انقلاب برپا کر دے یعنی انہیں خدا شناسی اور خود شناسی کی دولت سے مالا مال کر دے ۔۔۔۔۔ الخ"

میں آپ کی ان تجاویز سے کلّی متفق ہوں اور اس دعا پر اس خط کو ختم کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو عصرِ حاضر میں دعوت و تبلیغِ اسلام کی توفیق ارزانی فرمائے اور یہ حقیقت آپ پر واضح کر دے کہ مقصدِ حیات استرضاءِ باری تعالیٰ ہے نہ کہ حصولِ حکومتِ ارضی۔ حکومت یا خلافت ایمان و عملِ صالح کا ثمرہ ہے نہ کہ مقصود بالذات شئے۔ اور آپ سے استدعا ہے کہ آپ اس ننگِ خلائق کے خاتمہ بالخیر کی دعا فرمائیں۔

وقتِ طلوع دیکھا، وقتِ غروب دیکھا
اب فکرِ آخرت ہے، دنیا کو خوب دیکھا (اکبرؔ)

والسلام خیر الختام
مجمعِ عیوب و زشتی یوسف سلیم چشتی

وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

تدبرِ قرآن کا داعی

حکمتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نقیب

علومِ اسلامی کا ناشر اور "تنظیمِ اسلامی" کا حلقہ بگوش

دعوتِ توثیقِ عہدِ الست و تجدیدِ میثاقِ ایمان کا علمبردار

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیرِ سرپرستی

مولانا امین احسن اصلاحی

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد ایم بی بی ایس۔ ایم اے (اسلامیات)

قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

سالانہ زرِ مبادلہ ساڑھے سات روپے

مشرقی پاکستان سے بذریعہ ہوائی ڈاک: پندرہ روپے

شرائطِ ایجنسی

- ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔
- پرچہ صرف بذریعہ وی پی پی ارسال ہوگا۔
- کمیشن ۲۵ فی صد — محصول ڈاک بذمہ میثاق

یکے از مطبوعات

دار الاشاعت الاسلامیہ امرت روڈ کرشن نگر لاہور۔ ۱

تدبرِ قرآن ، ایک مفسر قرآن کی نظر میں

"بڑی ہی فکر انگیز اور اپنے رنگ میں بالکل منفرد تفسیر"

مولانا امین احسن اصلاحی کی 'تدبرِ قرآن' پر مولانا عبدالماجد دریابادی کا تبصرہ ،

تدبرِ قرآن - از مولانا امین احسن اصلاحی، جلد اوّل از آیت بسم اللہ تا سورۃ آل عمران، ۲۵+ ۸۵۰ صفحہ تقطیع ۲۲×۲۹ قیمت ۳۰ روپے - پتہ : دارالاشاعت الاسلامیہ، امرت روڈ۔ کرشن نگر۔ لاہور پاکستان ۔

حسن معنوی سے قبل نظر کتاب کے جمال ظاہری پر پڑتی ہے اور جم جاتی ہے ۔ کوئی تفسیر قرآن اتنی حسین و جمیل چھپی ہوئی دیکھنا یاد نہیں پڑتی ۔ کاغذ، کتابت ، چھپائی ، جلد بندی ہر اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے ——— معنوی اعتبار سے قرآنیات کے محقق جلیل اور مصنف کے استاد علّام مولانا حمید الدین فراہیؒ گویا از سر نو دنیا میں آگئے اپنے افادات بجائے عربی کے سلیس اُردو میں قلمبند فرما گئے ہیں ۔ قرآن مجید کے پہلو اور گوشے اتنے متعدد ہیں کہ کسی مفسر کے بس میں نہیں کہ ان سب کا بلکہ بیشتر کا بھی احاطہ کر سکے ۔ لامحالہ اسے کسی ایک نہ ایک نقطۂ نظر کا انتخاب کر لینا ہوتا ہے اور اسکے فضل و کمال کیلئے یہی بہت ہے کہ وہ اسی محدود دائرہ میں کامیاب ہو جائے ۔ مصنف کا اصل موضوع اپنے استاد ہی کی طرح ، نظم قرآن ہے ۔ ایک عمر انہوں نے قرآن کے اسلوبِ بلاغت ہی پر غور و تدبر میں گزار دی ہے اور قرآن کو جو کچھ سمجھا ہے کہنا چاہیئے کہ وہ قرآن ہی سے سمجھا ہے ۔ اور بڑے بڑے لطیف و نادر نکتے اسی کلام بلاغت نظام سے نکالتے چلے گئے ہیں اور اس کے بعد انہوں نے تکیہ توریت و انجیل (عہد نامہ عتیق و جدید) پر کیا ہے ۔ گو ایک نتیجہ اس تفرد کا یہ بھی نکلا ہے کہ بہت سی جگہ انہیں عام تفسیری مروجات کا ساتھ چھوڑ دینا پڑا ہے ——— غرض بہ حیثیت مجموعی یہ ایک بڑی ہی فکر انگیز اور اپنے رنگ میں بالکل منفرد تفسیر اردو میں آگئی ہے ۔ اہل علم و طلبۂ فن کے مطالعہ میں رہنے کے قابل اور بہتوں کے لیے ایک قابل قدر رہنما ۔ مصنف شبلی اور ندوہ کے سکول کے اہل قلم ہیں ۔ عبارت متین و محکم ، شستہ و سلیس ، شاندار اور باوقار مولویانہ نہیں ادیبانہ . . .

مصنف زندگی بھر اور کچھ نہ کرتے صرف یہی ایک کتاب اپنی یادگار چھوڑ جاتے تو بھی خدمت قرآن کا حق ادا کر جاتے ؛

صدق جدید، لکھنو ، یکم ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ

✿✿✿✿✿

ہندوستان کے حضرات !!

ماہنامہ **میثاق** لاہور

اور

دار الاشاعت الاسلامیہ لاہور

کی دوسری مطبوعات

کے حصول کیلئے مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک جگہ رقوم ارسال کرکے ہمیں مطلع کریں

(۱) دفتر ماہنامہ "الفرقان" کچہری روڈ۔ لکھنؤ

(۲) دائرۂ حمیدیہ۔ سرائے میر۔ اعظم گڑھ

اس سلسلۂ اشاعت کی دوسری کڑی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی ایک تقریر

"مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق"

انشاء اللہ جلد شائع ہو گی۔

مینیجر دار الاشاعت الاسلامیہ۔ کرشن نگر۔ لاہور

اسلام کی نشأۃ ثانیہ

کرنے کا اصل کام

***

از

اسرار احمد

مع تائید و توضیح بعنوان

فکر مغرب کی اساس

اور اس کا تاریخی پس منظر

از قلم

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

شائع کردہ:

دار الاشاعت الاسلامیہ امرت روڈ کرشن نگر۔ لاہور